

www.urduchannel.in

اردو چینل

www.urduchannel.in

انومتہ

اکرام باگ

## گوپی چند نارنگ

اکرام باگ اردو افسانے کے ایک تاریخی موڑ  
کی یاد دلاتے ہیں وہ ایک کاروان کے ساتھ بھی تھے اور  
نہیں بھی تھے ان کی فن کاری ان کی اپنی فن کاری ہے۔  
بیانیہ کی بناوٹ کرداروں کے اندرون میں جھانکنا اور  
نفسیاتی گہروں کی ہلکی گہری اشارت ان کی خاص ذہنی  
نچ بن گئی۔ ادبی مراکز سے دوری اور بھیڑ سے الگ  
ہونے کی خواہش اور اختصار پسندی ان کی تحریروں میں  
طرح طرح سے ظاہر ہوتی رہی ہے لیکن غور سے دیکھا  
جائے تو اپنے کرداروں کی ساخت، قصباتی جزئیات اور  
دھندلی دھندلی معاشرتی فضا سے جو نقش ابھرتا ہے اردو  
افسانے میں وہی ان کا دستخط بن جاتا ہے جس سے وہ  
الگ پہچانے جاسکتے ہیں۔

دسمبر ۲۰۱۳

# اکرام باگ

## اندوختہ

(افسانے)

افلاک پبلی کیشنز گلبرگہ

شہباز  
شہبیر  
ساحل  
کے لیے

**ANDOKHTA**

COLLECTION OF SHORT STORIES

**IKRAM BAAG**

PP.: 224, Year of Publication : 2014, Price : Rs. 300/-

Publisher: **AFLAAK PUBLICATIONS**

White House, New Bank Colony, Bilalabad, Gulbarga-585104, Karnataka

© : نسیم - بدر - نسیم

کتاب : اندوختہ (افسانے)

مصنف : اکرام باگ

اشاعت : 2014ء

سرورق : اعجاز مصور / سید مشتاق فاروق

کیوزنگ : حسن محمود

طاعت : اورین پرنٹرز حیدرآباد

بار اول : پانچ سو

قیمت : تین سو روپے

اہتمام : اکرم نقاش

پلے کے پتے

مصنف : ڈاکٹر اکرام باگ، چیئرمین، نانا ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ ٹرسٹ،

بسواکھیمان، ڈسٹرکٹ بیدر (کرناٹک)

Mob.: 09945969995 - 07204176727

ناشر : افلاک پبلی کیشنز، ہائٹ ہاؤس، زینو بینک کالونی، مال آباد، گلبرگہ (کرناٹک)

E-mail: [akramnaqqash61@yahoo.com](mailto:akramnaqqash61@yahoo.com)

Cell: 09845390893

## فہرست

### حرفے چند (اقتباسات)

11	_____	شمس الرحمن فاروقی
13	_____	سید مجیب الرحمن
17	_____	افتخار امام صدیقی
19	_____	مہدی جعفر
24	_____	اکرم نقاش

### افسانے

28	_____	توفیق
35	_____	اندوختہ
46	_____	زوالِ رفت میں پچھلی دھند
55	_____	چچی
59	_____	تصحیح
63	_____	دمِ اُفعی
69	_____	آتشِ عنقا
75	_____	حیات
84	_____	مدعا تہہ سنگ

## حرفے چند (اقتباسات)

91	_____	بر طرف فاصلے
98	_____	رکش پا
105	_____	عکس نما
114	_____	کابوس
118	_____	تقلیب
123	_____	تقلب
129	_____	اقلیم سے پرے ہو
139	_____	ادھورا پیہ
142	_____	آکینہ
145	_____	اندیشہ
148	_____	کوچ
152	_____	پڑاؤ
164	_____	اسیر بندہ
171	_____	بند سز عیث
182	_____	مظنون
192	_____	تقیہ بردار
199	_____	جے کی بی
216	_____	اس گلی سے

## شمس الرحمن فاروقی

اکرام باگ کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی کچھ پراسرار، کچھ خوف آگیاں فضا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ہماری دنیا میں موجود ہوتے ہوئے بھی کسی ایسی جہت میں گامزن ہے جو اُسے روزمرہ کی دنیا سے الگ لے جانے کے لیے کوشاں ہے۔ عام دنیا کی اشیا اور مقامات اور کوائف بھی ان افسانوں میں کچھ سرسئی، تاریک، گرد آلود رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔

اکرام باگ کی نثر اپنے قاری کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت نہیں کرتی۔ وہ بظاہر سادہ لیکن بہ باطن پیچیدہ نثر لکھتے ہیں۔ پڑھنے والا اگر متوجہ نہ ہو تو اس نثر کی خوبیاں اُس کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ اُن کی نثر بے حد گھٹی ہوئی اور ان کا ایک ایک لفظ دیوار میں چنی ہوئی اینٹ کا حکم رکھتا ہے کہ اگر ایک اینٹ بھی نکال دی جائے تو دیوار کی کلیت مجروح ہو جائے۔ چھوٹے، گھٹے ہوئے جملے، اثر آفرینی کی واضح اور کھلی ہوئی کوشش سے بالکل مبرا۔ جملوں میں سحر کی سی قوت ہے جو آہستہ آہستہ قاری پر مستولی ہو جاتی ہے۔

اکرام باگ کے افسانوں میں ایشیا کے احساسات کے زندگی کے رابیکاں جانے کا تصور حاوی ہے اور اس کے ساتھ ان چیزوں کے ہوجانے کی تمنا جو ہوتیں سکتی۔ پھر ان چیزوں کی جلد نفی چیزیں رکھ کر حقیقت کو بہلانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ("اندوختہ" کے منظم وید نے اپنی لڑکی کا نام اس لڑکی کے نام پر رکھا ہے جو اس کی معشوقہ نہ بن سکی اور خود اس لڑکی نے اپنے بیٹے کا نام افسانے کے منظم کے نام پر رکھا ہے) لیکن یہ سب زیاں کیوں ہے۔ چاہی ہوئی چیزیں کیوں قوت سے فضل میں نہیں آتیں؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اکرام باگ قاری کو تہما چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ جھوٹے حل پیش کر کے قاری کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے۔ "حیات" نامی افسانے میں "حیات" یہ معنی زندگی بھی ہے اور افسانہ نگار کے اس کردار کے بھی معنی میں ہے جو افسانہ نگار سے کھو گیا ہے، یا جدا ہو گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں "حیات" کے معنی تو معلوم ہو سکتے ہیں لیکن کیفیت نامعلوم رہتی ہے۔

اکرام باگ کے افسانے بنیادی طور پر ذاتی الیے کی داستانیں ہیں۔ انھوں نے تجزیہ اور شدت تاثر سے بھرے ہوئے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں علامت کے پردے میں تمام تر معانی اور گہرائی کے ساتھ باہر کی روشنی اور اندر کی روشنی کو یکجا چھان کر سنے رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔

اکرام باگ کے افسانوں کا مجموعی تاثر زیاں اور گزران کے ماتم کا ہے۔ دنیا کا رگاہ عمل تو ہے لیکن اس کے عمل زیادہ تر زیاں، گم شدگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ انسان اپنی تمام ذہنی اور علمی قوتوں کے باوجود دنیا میں پوری طرح قائم نہیں ہوتا۔ اس کے دوست اور چاہنے والے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

ان کی تحریروں نے جدیدیت اور "شب خون" کو اظہار بخشا۔ اگرچہ میں ان کے بارے میں کبھی کبھ لکھ نہ سکا لیکن جدید ادب کی جدوجہد ان کے بغیر کامیاب نہ ہوتی۔

●●

### سید مجیب الرحمن

اکرام باگ کا ایک لکھنے والوں سے مختلف سمت میں جاتے ہیں۔ کلاسیکی لوگ کرداروں کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔ کہ جیسے وہ آخری حقیقت ہوں۔ مگر اکرام باگ ان کے نام تک نہیں رکھتے۔ میں دو، دو، دو، دو، دو، دو یا ہندسوں سے زیادہ نام نہیں دیتے۔ گویا یہ سب نشور ہیں۔ فانی ہیں۔ انکی ہستی تپ ہی جگی ہوگی جب وہ ان کریمہ نیتوں اور کریمہ اعمال سے نجات پا کر مکمل اکائی بن جائیں۔ کردار کی عکاسی پر وہ الفاظ کے اصراف کے خلاف ہیں۔ مگر وہ اتنی چابک دستی سے استعاروں سے کام لیتے ہیں کہ اس سے کردار کی ساری کیفیت سما جاتی ہے۔ مثلاً چکاؤڑ شاہزادی، شاہزادہ، پرچھا کیس، سازن، سینی، کلورڈفل، زہد، جھاز، 45، درجہ کا زاویہ (محبت کرنے والا)، زور، رنگ آلود، تھپیار، بیساکھی، رنگ زار، بوڑھا بندر، دیمک، دھواں، شیر، بلی، ریگستان، کالا سانپ، گرگٹ، سیاہ ماسے، گوریلا، دھتلا (بے اصولے شادی کے گواہ) مرغیاں وغیرہ۔

اکرام باگ کے سارے افسانوں کا نچوڑ یا تو فکری نتائج ہیں یا فلسفیانہ تجزیہ، اچھے فن پارہ میں یہ تصور برقی ہے کہ جذبوں سے کردار بنتے ہیں اور کرداروں کے عمل سے



مواخذہ۔ اکرام باگ اس پر سے عمل کو مواخذہ یا مکافات عمل NEMESIS کو ظاہر کرنے والے استعاروں سے دہرا کر لیتے ہیں اور تہیہ اخذ کرتے ہیں کہ جب تک آدمی اکائی نہیں بن جاتا ہے اسے مکافات سے نجات نہیں۔ اکائی بننے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ وہ تفصیل سے نہیں بتاتے ہیں مگر کسی کردار کے ذریعہ وہ اشارہ کرتے ہیں:

”میں اچھی خدا ہی نہیں بلکہ اس کی لذت کو بھی محسوس کرنا چاہتا ہوں“

ان کا یہ جملہ بہت فلسفیانہ اور بڑ مغز ہے کہ انسانی ذہن کی تہذیب اسی طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ مشاہدہ کے ہم راہ رہے پر آئندہ نہ رہے۔

یوڈیلر نے فکری لغزہ لگایا تھا کہ فطرت کراہتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور فن کار کا کام ہے کہ فن کے ذریعہ فطرت کی کیوں کو دور کرے۔ اکرام باگ کے یہاں فطرت میں ازیت پسندی کے عنصر کی عکاسی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ کبھی ازیت سادیت SADISM یعنی ایذا رسانی کی شکل میں ہے تو کبھی ازیت کے روپ میں IMASOCHISM اکرام باگ کہتے ہیں۔

”انسان بھی کتنا ستم ظریف ہے کہ اہرام رکھنے کی عادت کا خواہ وہ اپنی ہی ذات پر کیوں نہ ہو کس نئی طرح شکار ہے۔ اسے ایک پل چین نہیں رہتا۔ کسی نہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر وہ اپنے اندر رطمانیت اور سکون چند لمحوں کے لیے کھی پیدا کر لیتا ہے۔“

ایک دوسری جگہ وہ کہتے ہیں:

”زندہ فن کی تخلیق کے لیے کسی پریرنا کا ہونا ضروری ہے، یہ پریرنا کاغذ ہونا یعنی کسی محبوب شے کو نہ پاسکتے کاغذ۔“

گویا ان کو قدرت کا یہ قانون پسند نہیں ہے کہ فطرت کی رحمت ہی سرچشمہ فیضان ہے۔ خود رحمت فیضان کیوں نہ دے۔ یہی ان کا بنیادی سوال ہے۔

وہ روح کے بارے میں پڑھ کے انداز میں سوال کرتے ہیں کہ

”انسان میں جینے کی تمنا کتنی فریب ہے۔ زندگی خواہ گھسیٹ گھسیٹ کر رہی گزرے مگر وہ موت کے آرام دہ ہنسر پر سونا نہیں چاہتا۔ جینے کی ہوس نے ہی شاید روح کی عظمت کا فلسفہ ایجاد کیا ہوگا۔ وہ موت کے وقت بھی یہ یقین کر کے خوش رہتا ہے کہ کم از کم اس کی روح تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گی۔“

سائنسی ازیت کو وہ ایک کردار کی شکل دے کر کہتے ہیں۔

”سائنس دان عقل کے پاس پہنچ کر کہتا ہے ہماری مسکراہٹ میں ہیر و پاشا کا سارا درد مسکرا رہا ہے۔“

ذہن کی عدم تکمیلی IN-STABILITY کے بارے میں وہ کہتے ہیں

”کھانا کھاتے ہوئے میں صرف اس کی لذت سے لطف

اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ انسان کا شعور لاشعور ایک ہو جائے

یہی میری آرزو ہے۔ آخر میں مکمل اکائی کیوں نہیں

ہوں۔ جس دن آدمی مکمل اکائی بن جائے گا شاید اسے اپنے

قنا ہونے کی تک نہ متائے۔“

گویا اس پیرا گراف میں ذہن کی تہذیب کے طریق کار کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ہم مکمل اس لیے نہیں بنتے کیوں کہ ہم حقیقت کے ساتھ ساتھ باشعور نہیں ہیں۔ مشاہدہ کا باقاعدہ شعور ہمیں لاشعور کا مالک بھی بنا دے گا۔ تب قطرہ سمندر بن جاتا ہے۔

ارونک آرٹ میں عشق اور فلسفہ کی مثالیں بے انتہا ہیں۔ پختگی تحریک اور

صوفی شعرا کا سارا کلام اسی کے زیر اثر میرا بائی، کبیر، تانک، اکامہادیوی تو خدا کو اپنے

محبوب کی طرح مخاطب کرتے تھے۔

اکرام باگ کے آرٹ کو بھی ہم عشق اور فلسفہ کے خانے میں ڈال سکتے

ہیں۔ عشق کی جب شروعات ہوتی ہے تو وہاں ساری کائنات میں صرف وہی ہتھیاں

رہتی ہیں۔ ایک موضوع SUBJECT اور دوسرا معروض OBJECT اور جب

عشق اپنی اجنبی کو پہنچاتا ہے تو نہ ہی وہاں موضوع ہوتا ہے اور نہ محروض۔ ایک شادی کی حالت ہوتی ہے۔ اکرام باگ دو مونیوں کی بحث کو اپنے افسانے میں جکڑ دیتے ہیں۔ اور خود بھی اس سے مستفید ہونے کا انداز ظاہر کرتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر کا صوتی کہتا ہے کہ وجود کے ہر مظہر میں خدا کا ہی وجود ہے۔ (وحدت الوجود) اور دوسرا کہتا ہے کہ خدا کا وجود الگ قسم کا ہے، اور اس کی تخلیق کا الگ (وحدت الشہود) اس بحث سے آگیا کہ وہ اس تجربی نقطہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں عمل اکائی بن جانا چاہئے۔ یہاں بھی ہم اکرام باگ کو بدھ کے تصور سے مماثلت رکھنے والا پاتے ہیں۔ غالباً انہیں وجود کی بحث رٹی رٹائی اصطلاحیں لگتی ہیں۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ ہم جو اس سے واقف ہیں اور ایشیا کو بھی دیکھتے ہیں۔ ان دونوں کے طن سے ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔ جو یادوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی یادیں آرزو کی شکل میں مماثل حالات میں بار بار جکڑ جکڑ بنم لیتی ہیں۔ گویا یہ سب دل کو گرفت میں لینے والی یادیں سنسکار میں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ہمیں پورا کرو۔ اور وہ سدا خوش کامی سے محروم ہوتی ہیں۔ آدمی کی خوش کامی تو اس میں ہے کہ وہ خود کو غیر محدود بنانے میں لگ جائے۔ بس یہی ایک آرزو ہے جو چلی ہے۔ اس غیر محدود پن کا کوئی نام نہیں ہے۔ حسن نہیں۔ اور نہ کوئی فارم۔ ●●

## افتخار امام صدیقی

اکرام باگ کی پہلی کہانی ’’دوم‘‘ ’’افعی‘‘ اور اس کے بعد تازہ ترین دست یاب کہانی ’’تولیق‘‘ تک ان کے افسانوں کی پوری طرح اہتمام و تفہیم نہیں ہو سکی۔ جدید تر کہانی کے اس اہم نام کو محض تجزیہ و علامتی کہانی یا تجربوں کی کہانی کی ایک مختصر تاریخ کے باب میں جگہ مل گئی لیکن شاید کہانیاں اپنے باطن میں تخلیقی آگ چھپائے ہوئے ہیں، ان پر مکالمہ نہیں ہو سکا۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں۔ مگر ان وجوہ سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف کہانیوں کے باطن اور اکرام باگ کے تخلیقی جوہر سے بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اکرام باگ کی کہانیاں اپنے تمام تراجم اور ڈوں کے باوجود نظر انداز نہیں کی جاسکتیں، انہیں محض اس لیے روئیں کیا جاسکتا کہ یہ افسانے کے رواں منظر میں نہیں۔ تاہم یا انہیں افسانے کی کلاسیکی روایت میں بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ کہ سرے سے یہ افسانے ہی نہیں، اگر یہ افسانے نہیں تو پھر یہ کس نوعیت کی تحریریں ہیں؟

ایسا تو نہیں کہ افسانے محض خواب سراپ ہوں، جو نظروں، بھلوں میں بغیر کسی ترتیب کے اتر آئے ہوں۔ اپنی تخلیقی ترتیب میں ماہرہ، ان کہانیوں سے باہر کوئی بھی گفتگو، کوئی بحث، کوئی مکالمہ، اکرام باگ کو سمجھنے میں زیادہ معاون نہیں

ہوگا۔ تصوف، مذہب، علم نجوم، جمالیات، کے ساتھ تخلیق کیے گئے یہ افسانے اب بھی  
انتظار کر رہے ہیں اپنے قاری کا۔ سچے اور باشعور نقاد کا اور خاص طور پر جدیدیت کے ان  
میلین کا جو اس نوع کی کہانیوں ہی کے خواہش مند تھے۔

●●

### مہدی جعفر

اکرام باگ کے افسانے تجزیاتی اظہار پر محمول ہوتے ہوئے اعلیٰ اسٹوری  
کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔ ان کے افسانے بالکل ہی منفرد انداز میں بیان ہوئے  
ہیں۔ عام طور سے افسانہ نگار حضرات اپنے منفرد رویے اور رجحان کی خاصیت کو نمایاں  
کرنے سے شعوری یا غیر شعوری گریز کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی بے اعتمادی ہے جو  
دراصل اپنی انفرادی پہچان اور اپنے خالص رویے کی اچھی طرح دریافت نہ کر پانے کے  
باعث ہوتی ہے جس میں دوسرے افسانہ نگاروں اور قاری سے رابطہ کا یقین اور آہنگ رکھنے  
کی کوشش شامل ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر تخلیق خارج کے اثرات سے نسبتاً زیادہ متعلق  
ہو جاتی ہے اور داخل کے عوامل اور طریق کار سے کم۔ کئی انفرادیت کا بے پایاں اظہار جو  
موضوع سے انحراف پر اکساتا ہے اسے دبا جانے اور پس پردہ رکھنے کے طریقہ سے افسانہ  
نگار اپنے وجود اور نام کی پہچان برقرار رکھنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتا۔ جب کہ مکمل  
انحراف میں افسانہ نگار اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ اپنی عام آواز گم نہ کر دے اور ہم  
عصر رجحانات اس کے افسانوں کو کافقہ کے انبار میں دفن نہ کر دیں۔ اس لحاظ سے اکرام  
باگ کے یہاں ایک جرأت ملتی ہے اور ان کے افسانے موضوعی محور کے گرد گھومتے نہیں

بلکہ ان کے یہاں موضوع کی روایتی بنت سے انحراف ملتا ہے۔ دوسری چیز جو افسانوں کو اپنی اسٹوری سے قریب کر دیتی ہے وہ وقت کا ٹھہراؤ ہے۔ وقت تقریباً ایک ہی نقطہ پر رک کر افسانے کی تخلیق کرتا ہے یا نہایت سست روی سے آگے بڑھ کر ایک دائرے کی شکل میں اپنے پہلے سرے سے بڑھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "قلیما سے پرے ہو" کے ابتدائی حصے میں انفرادیت کے داخلی عوامل نکراؤ پیش کرتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک فرد پر جو کچھ گزری ہے اس کا احتساب اور آج کی سطح پر اس کا مؤثر عمل شہور کی زد جیسی کیفیت سے آجا کر ہوا ہے۔ روایتوں کے گزرتے اثرات عصر حاضر کے عوامل کے سامنے اپنے بے دست و پا ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ سب کا سب ایک ہی لمحہ ہے۔ وقت کی ایک ہی سطح ہے۔ اس لیے کہ یہ مرکزی کردار کی زندگی کے بہت محدود حصہ پر مرکوز اور محیط ہے جس کا ثبوت افسانے کے شروع کا ایک پارہ ہے اور وہ پارہ جو اختتامیہ ہے:

"شام تھی۔ میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا کی کرکٹ کھڑی سے فارغ ہو کر گھن میں پہنچا تو شہوت کے درخت کے قریب وہ آنکھیں یک تنگ مجھے گھور رہی تھیں۔ جنس سے نکلا۔ اقلیما۔ اور میں شوق آسادی میں ڈوب گیا۔ وہیں بیت اللہ سے متصل دیوار کے قریب ہم نے بدنام لفظ کی دیوار کو آخری اینٹ دے دی".....

"میں رفیع حاجت کے لیے اٹھتا ہوں مگر گھن میں کھڑا نیم کا درخت میرے قدم روکتا ہے۔ تنے سے سر نکالنے، آنکھیں میچے، ہدایت کردہ سمت میں منہ اٹھانے، وہ ہراتا ہوں، جب آنکھوں سے روشنی اچھلی جائے گی اور....."

(قلیما سے پرے ہو)

زخشن یا انفرادی حیثیت سے اہم ہے۔ شاید یہ ان کی پہلی کہانی ہے جہاں سے وہ انفرادیت کی ایک نئی سطح کی نمائندگی کرتے ہیں اور شاید یہیں سے وہ روایت سے

کامل انحراف کرتے ہیں۔ اس کہانی میں "میں" ایک عجیب و غریب میڈیم میں سانس لیتا ہے۔ یہ میڈیم لاشوری حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شخصیت کا ٹوٹا ہوا شہور کی زد "میں" کی داخلی حیثیت اور وسعت "میں" کی اجتماعی اور سماجی ربط، جہت اور وجدان کے عناصر، داخلی اور حیاتی سطح پر ہوتے ہوئے بھی منطقی نتائج سامنے لاتے ہیں۔ نتائج حاصل کرنے کا طریق کار ریاضی اور بالخصوص اشکال ریاضی کی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تجزیاتی طور پر فلسفہ کی کیا اور حیاتیات بھی ان کے ساتھ آمیزش رکھتے ہیں۔ دوسرے افسانے جن میں یہ مندرجہ بالا کارفرما نظر آتی ہے۔ "ہندسہ صیغہ" "عکس فضا" "اسیر ہندسہ" اور "بہ طرف قاصطے" ہیں۔ ان بھی افسانوں میں انفرادیت کی ریاضیاتی سطح خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقلیدس کا یہ کہنا کہ سارا عالم سوائے جیومیٹری کے اور کچھ نہیں، شاید انفرادیت کے انہیں فعال ذہنی عوامل کا بروئے کار لانا تھا۔ انہیں اکرام باگ نے اپنے افسانوں کی سطح پر استوار کیا ہے، اور برٹریڈرسل نے اپنے فلسفہ کی سطح پر جگایا ہے۔ کچھ بھی ہو مگر یہ بات ضروری ہے کہ اکرام باگ کی تخلیقی زد اقلیدس ہے اس لیے کہ ہر افسانے میں ریاضیاتی، منطقی یا سائنسی طریق کار ملتا ہے۔ جدید افسانے میں اس طریق کار کا استخراج بنیادی ذہنی عوامل کے ساتھ، جن کا علاقہ منطق سے پرے ہوتا ہے، ایک انوکھی اور اہم خصوصیت ہے۔ اکرام باگ باریک سے باریک تقطوں پر دریک نظر کر قاری کو اس کی معنویت اور مفہوم اپنے اظہار کے توسط سے سمجھاتے ہیں۔ البتہ اس طرح ان کے کچھ افسانے اپنی وضاحت اور ایک سطحی داخلیت کی وجہ سے افسانہ نگار اور مضمون زیادہ معلوم ہوتے ہیں اور ایک وسیع پس منظر کی عدم موجودگی کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کے قائم رہنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ افسانوں میں Persona یا "میں" کی انفرادیت اپنی داخلی بنت رکھتی ہے اور خارج سے اس کا علاقہ کم ہوتا ہے۔ خارج کو اہمیت کم دینے کی وجہ سے افسانوں میں وہ تانے بانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں جن کے ذریعے افسانوں کا بنیادی ڈھانچہ آسانی سے گرفت میں آسکے۔ بہ ہر حال افسانوں میں دنیا، مذہب اور انسانی وجود کی سرچھی آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے جو آپس میں عمل اور رو عمل کے ذریعے ذہنی و ذہنی ابھرتی رہتی ہے۔ خارج کے توسط سے قاری تک رسائی کی بات

اپنی ضروری نہیں کہ اس کوشش میں افسانہ نگار اپنی بنیادی انفرادیت سے دست بردار ہو جائے یعنی اپنی تخلیقی رو سے رشتہ توڑ لے۔ لیکن اکرام باگ کے چند افسانے خارجیت کی طرف اس تیزی سے بڑھتے ہیں کہ وہ داخلیت کی پہچان خود دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں اور اپنی اقلیدی ہنت کو توجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خارجی کیفیات اور مظاہر میں اس مخصوص جہت کی تصویر کشی کر سکتے تھے اور داخل اور خارج کے دائرے کو باہم ملا سکتے تھے۔ 'کابوس'، 'ادھورا پیہ'، 'چچی'، 'تکلیب' اور 'تھنج' وہ افسانے ہیں جن میں کوشش خارج کی طرف سے ہے۔ مگر یہ افسانے غالباً اس لیے ناکام ہیں کہ یہ صرف تجربہ کی صورت میں تخلیق ہوئے اور ان میں سے کئی انور سجاد کے اسلوب اور تکنیک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان تجرباتی کوششوں اور غیر تکنیکیات کے احساس کو ادھورا پیہ میں لاشعوری یا شعوری بیچ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

”جب یہ احساس اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو میں اپنی دیوانگی اور فن کاری اُس دیمک زدہ لکڑی پر صرف کرتا ہوں کہ کسی طرح پیہ مکمل ہو جائے اور ہم اسے سرنگی سطح پر معلق کیے اپنی بازیافت اور تکمیل کو دیکھ سکیں۔ مگر اندر کا چھوٹا دائرہ باہر کے وسیع دائرے سے دیمک کے باعث جڑ نہیں پاتا۔“

(ادھورا پیہ)

اکرام باگ کے افسانے تجربی ہیئت اور رمز کے حامل ہوتے ہیں۔ انھوں نے روایتی پلاٹ والی کہانیوں سے انحراف کیا۔ اقلیم سے پرے 'اسم اعظم'، 'تقیہ' بردار رمز یہ صفت سے متصف ہیں۔ اکرام باگ کا حالیہ افسانہ 'توفیق' بھی اپنی رمز یہ شناخت پر مضمون ہے۔

”سلسلہ اور تکمیل دونوں ہی رمز ہیں۔ مجھے آج بھی اس باب میں یقینی شک ہے کہ کون کس رمز سے کب وابستہ ہوا۔ میں تم سے اس بات کی وضاحت ضرور کروں گا کہ اس سلسلے کا آخری سر امر مرکزی اقامت گاہ نہیں ہے۔ لیکن تم اگر اسے تکمیل سمجھو تو

اس باب کا آخری سر امر مرکزی اقامت گاہ تھی۔ اپنی اپنی توفیق۔“

ان کے یہاں نامیاتی جسامت Organic Growth نہیں ملتی۔ ان کی افسانوی ہیئت میں الفاظ کی اچھوتی اور نئی ترکیب ملتی ہے جو اپنے استعمال میں بڑی خوب صورت تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً 'باعتب' یا 'بمقلب' سوئی، 'کھلی' ہوئی دوپہر، 'عدم' یا 'نی'، 'پھلیوں کے آئینے' وغیرہ۔ زبان محکم محکم کر آگے بڑھتی ہے اور اپنا الگ آپٹک بناتی ہے۔ داخلیت کے اظہار کے لیے اکرام باگ جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ اس لحاظ سے تو ازن اور تناسب رکھتی ہے اور جس پر بہت کم افسانہ نگار دسترس رکھتے ہیں۔

بیانیہ کی بجائے مختلف ہونے کے باوجود اکرام باگ اور تیر مسعود ہمارے عہد کے ایسے افسانہ نگار ہیں جو اسرار و تجسس خلق کرنے، کہانی کے بیان سے گریزاں اور موضوع کو پردوں میں چھپانے کے فن میں مماثل نظر آتے ہیں۔ اپنے فن پر غیر معمولی اعتماد، سلسلے و سائنس کی تمنا سے بے نیازی اکرام باگ کے Genuine فن کار ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ہڈ اسراریت ان کے فن ہی نہیں شخصیت کا بھی خاصہ ہے۔ ●●

## اکرم نقاش

افسانے کی متداول شعریات سے انحراف اور افسانے کی نئی رسومیات کے اختراع کی سہی اکرام باگ کے افسانوں میں آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہے۔ اکرام باگ نے جس طرز کے افسانے لکھے، افسانوں میں جیومیٹری، ریاضیات اور طبیعیات کی اشکال کو فنی اظہار کا ذریعہ بنایا اور جو سبھی تجربے کیے اس کی نشانیوں اس دور سے پہلے ملنا محال تھیں ہی اس کے بعد بھی اس سطح کی تجربہ پسندی و تجریدیت کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اکرام باگ کا افسانوی کرافٹ مینش Craftsmanship نہیں بلکہ ایک تخلیقی کرافٹ ہے۔ اکرام باگ کہانی بیان کرنا نہیں، کہانی کو بیرونی پردوں میں چھپانا چاہتے ہیں جس طرح سورج کی کرنیں زمین میں پوشیدہ خدو خال کی ہلکی ہلکی جھلک دکھاتی ہیں اسی طرح اکرام باگ کہانی کے ان ہی پہلوؤں کو اجاگر کرتا چاہتے ہیں جہاں سے تجسس جنم لینے لگتا ہے، اسرار پینچنے لگتا ہے، یہ عمل کہانی بیان کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ان کی کہانیاں قاری پر کھلتی نہیں ہیں، موضوع قاری کی گرفت سے دور ہوتا ہے لیکن ایک پرفیکٹ اسرار و انبساط ایک نامانوس سرشاری ذہن پر دیر تک چھائی رہتی ہے۔

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے

## افسانے

## توفیق

”سلسلہ اور کھیل دونوں ہی رمز ہیں۔“

مجھے آج بھی اس باب میں یقینی شک ہے کہ کون کس رمز سے کب وابستہ ہوا میں تم سے اس بات کی وضاحت ضرور کروں گا کہ اس سلسلے کا آخری سرا مرکز ی اقامت گاہ نہیں ہے۔ لیکن تم اگر اسے کھیل سمجھو تو اس باب کا آخری سرا مرکز ی اقامت گاہ تھی۔ اپنی اپنی توفیق۔

میں متعین کردہ وقت پر بس اسٹینڈ پہنچا۔ مجھے یقین تھا اور میں نے دو ٹوک لے لیے تھے۔ سامنے پولیس اسٹیشن میں ہجوم کسی جانے پہچانے قیدی کو احاطے سے اچک اچک کر دیکھنے میں مشغول تھا۔ ایک ان جان سی تشویش مجھے بھی ہو رہی تھی۔ بار بار میری نظریں ہر گزرتے ہوئے رکشہ پر ٹک جاتیں۔ شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ دوسورج درگاہ کے کٹس

پر ہانپ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں میں نے تمہارا لرزتا ہاتھ پکڑا تو خودمرا جسم بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ تم جانتی ہو کہ وقت سفر میں نے متعین نہیں کیا تھا۔ اس وقت تمہاری عارضی اقامت گاہ تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ تارکول کی سر دسڑک سے تیلی گلی میں مڑتے ہوئے گرم مرکزی اقامت گاہ ہماری متوقع منزل تھی۔ نیم اندھیرے کمرے میں سر کے مقابل بیٹھی آئینہ متحرک ہوا۔ اب سامنے دیوار سے لگے بک میں رگی سبز لباس لہرانے لگا اور غیر رگی دودھیہا لباس زیب تن ہوا۔ سفید پنڈلیوں پر مانوس بھوری روئیں کے لمس پر تنفس رک گیا۔ پھر اچانک سفید سیاہ لکیروں کے تحریک پر دودھیہا مخصوص ہیئت میں نیم اندھیرا اتملانے لگا۔ تمازت کے کبوتر سینے کے اندر پھڑ پھڑاتے رہے، چاروں طرف دلدل تھی۔ زمین سے ابھرتی ہوئی دلدل جو فضاؤں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اپنی پہچان کے سارے غوطے دلدلیٹ ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ بیٹھی آئینے میں مجھے اپنی شکل نظر نہیں آئی۔ صرف سیاہ اور سفید لکیروں کا موٹا ڈرا۔ ابھرتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔

جب صبح کے بطن سے مڑی تڑی رات طلوع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اپنی ٹیلی کے سارے کنکر نکل چکے تھے۔ شش سالہ سلسلے کے ان کنکروں کو اس کھیل میں صرف ہونا تھا؟ پھر بھی سلسلے کے بطن سے کھیل کا اکھوا تو تمہارے بعد کے استفسار کی آبیاری سے پھوٹا تھا۔ میں تم سے پھر نہیں پوچھوں گا کہ بیچ کس نے بوئے تم نے یا میں نے؟ ویسے میں نے تو تمہیں جواب دیا ہی تھا کہ افسوس تو لذتوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔

”افسوس“ انھوں نے ایک گھونٹ جام کا لینے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔  
 ”زندگی ایک ایسے کھیل کا سلسلہ ہے جس کے سرے ہمیشہ سے ملے ہوتے ہیں۔  
 لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کھیل کا ہر سلسلہ الگ الگ ہے۔ تم پہنچے نہیں ہوا۔“



میں نے ان کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے اپنا سوال دہرایا: ”آخر کس تفکلی نے آپ کو اس حجرے تک پہنچایا۔“  
 ہمارے گاؤں کی گلیاں خون سے بھرے کچھڑے لت پت رہتی ہیں۔ یہ خون تاریخی بھی ہے اور جغرافیائی بھی..... گاؤں سے دور کنارے ایک درگاہ ہے۔ اس درگاہ کے قریب تنہا حجرے میں اکے تھکا ماندہ، مجبول، نیم غنودہ ڈھولک کی تال پر کثرت کی باتیں کرتا ہے اور وحدت کی تلقین۔  
 میں نے پھر سے انہیں اعداد میں الجھتے دیکھ کر ٹوکا: ”آپ کو کون سی شے اس حجرے تک لے گئی۔ کشف یا لذت؟“

”40“ قلم رکھتے ہوئے انہوں نے نیچے سے اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”تمہاری اور میری عمر کے فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی میں تمہیں اپنی رواد سناؤں گا۔“  
 ”میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی کہ میں نے بجلی خان کی مسجد میں قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ امام صاحب کو صبح اور شام کا کھانا پہنچانا، یہی میری فیس تھی۔ میرے ساتھ اور بھی لڑکے پڑھا کرتے۔ ہمارے عقائد میں امام صاحب کے اعتقادات کا بڑا دخل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ ایک ہے۔ اور رزاق ہے مگر بغیر وسیلے کے اس تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ حضور ﷺ شافع محشر ہیں اس لیے ہر مسلمان بالآخر جنتی ہے۔ نماز دل سے پڑھنا چاہئے۔ روزہ اور زکوٰۃ کے شرعی اصول سب کے لیے یکساں ہیں اور معارفانہ اصول اس کے اُلٹ ہیں۔ عارف اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا۔ جس نے حج کیا اور حضور ﷺ کے روضے کی زیارت کی اس کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں..... ان دنوں ہر جگہ میں سلطنت آصفیہ کے عروج اور استحکام کا خطبہ بھی دکن کی ہر مسجد میں پڑھا جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں بھی رضا کار

تنظیم قائم تھی۔ میری صحت اور امارت لائق تحسین تھی اس لیے میں بھی روزانہ پریڈ میں شامل ہوتا۔ سربراہ تنظیم مملکت ہندوستان کی سیاسی، فوجی، ریشہ دوایتوں سے واقف کراتے۔ اپنی نیم فوجی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے کھیت میں بھی کام لینا اور کرنا پڑتا تھا۔ میری نوجوانی کے دن تھے اور اطراف میں کئی چراگا ہیں تھیں۔ ہمارے کھیت میں کئی سو آم کے درخت تھے اور آموں کا کاروبار مجھے بزاراں آیا۔ آموں کی نگہداشت کرنا میری سب سے بڑی باہلی تھی۔ چٹاں چٹاں اطراف کے کئی ایک درختوں کو خریدتا رہا..... اس اثناء میں پولیس ایکشن ہوا..... ہندوستانی فوج دکن میں داخل ہوئی۔ سلطنت آصفیہ کا چراغ بغیر کسی پھونک کے بجھ گیا۔ ہمیں تنظیم میں محفوظ رہنے کی ترکیبیں بتلا دی گئی تھیں۔ چٹاں چہم میں بہت سے لوگ اس بلا سے بچ گئے اور غیر ٹرینڈ لوگ اس کی زد میں آ گئے۔ ان دنوں قدرت بھی مہربان تھی۔ لیکن میں نے آج تک کبھی ماہ ستمبر میں اتنی طوفانی بارش نہیں دیکھی۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہوئے اور لوگ باگ اطراف کھڑی فصلوں کے اندر چھپے رہے۔ مجھے اپنے ایک ہندو کارکن کے گھر میں پناہ ملی..... یہ ہر حال ہر قسم کے اٹانے لوٹے گئے۔ اسن ہوا تو لوگ سرا سہ اور سکتے کی حالت میں تھے۔ پانی کی افراط تھی مگر ہر طرف تشنگی تھی۔ باؤلیاں صاف کی گئیں۔ گم شدہ انسانوں کا سراغ برآمد ہوتا رہا۔ گلیوں میں کھیت اگ آئے تھے۔ محلے کے لوگوں نے مجھے اپنے محلے سے اسن کمیٹی کا رکن منتخب کیا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی مسجد کا امام مقرر ہوا۔ میرا اپنا بہت کچھ باقی رہ گیا تھا۔ پھر کانگریس کے کلکٹ پر میونسپلٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ لاری کا کاروبار شروع کیا۔ آندھرا سے مہاراشٹر چاول درآمد کرنا جان جو حکم میں ڈالنا ہوتا تھا۔ پھر بھی اپنے رسوخ سے اس علاقے کو سال بھر چاول درآمد کرتا رہا۔ اب گاؤں کے لوگوں نے مجھے اپنی ہراجنمن کا صدر بنانا شروع کیا۔ میں ہر سال گیارہویں شریف بڑے اہتمام سے کیا کرتا تھا۔ قومی انجمن

کے تحت میں نے گاؤں کی پردہ دار بچیوں کے لیے مدرسہ نسواں کی بنیاد ڈالی جو اب شبانہ روز کی محنت کے بعد کالج تک پہنچ چکا ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے عزم جگایا۔ حج سے واپسی کے بعد لوگوں نے مجھے بتلایا کہ گاؤں کا پہلا حاجی ہوں..... کیا زندگی تھی؟ انھوں نے لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”قطرہ اور موتی کے بیچ توفیق کا سلسلہ سب سے بڑا کھیل ہے۔“ انھوں نے انسر دہ

لہجہ میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”ہر اقامت گاہ میں ایک کابوس رہتا ہے جو ہماری تنگی چوستا رہتا ہے۔“

”کون سی اقامت گاہ؟“

”اس زیاں کار زندگی میں سلسلہ اور کھیل دونوں ہی رمز ہیں۔“ انھوں نے خلا میں اپنی شمار آلود آنکھیں نکاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اور اس کابوس کے لیے تمہیں غذا تو فراہم کرنی ہی پڑے گی اور سب سے بہتر غذا تو تم خود ہی ہو۔ اس لیے تو ڈھولک کی تال پر آواز گونجتی ہے۔ اپنے آپ کو کم کر یہاں تک کہ اقامت گاہ میں کوئی گاہ نہ رہے۔“

”اقامت گاہ!“

پتہ نہیں کون کس سے کب وابستہ ہوا۔ یہ کھیل ہے یا سلسلہ۔ میں نے سوچا اہلی کے درخت کے پاس میں نے اپنے منہ اور وہم کو اطمینان کا روپ دینے کی کوشش کی۔ ہلکی سی بوندا باندی اب بھی ہورہی تھی۔ وہ میرا پہلا دن تھا۔

بلاوے کے اس دن مجھے اس بات کی طمانیت تھی کہ محض شکل اور صورت اور حیثیت

سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے وہ سارے احمقانہ رد و بدل آئینے کے مقابل کر لیے تھے۔ جو جیب میں لمبی اجنبی شبیہ کو ابتدائی مرحلے میں ایک حد تک گوارہ کر سکتے تھے۔ ویسے تو میرا اصل سرمایہ تو قلم اور کلام ہے۔ میں نے بعد کے ایک موقع پر تم سے کہا تھا۔ قلم اور کلام تو مناسب آدمی کی سحر کاری کے اولین اعمال ہیں۔ یہ دن جون کا آخری دن تھا۔ جون کے مہینے میں ویسے بھی غلیلیں تنی رہتی ہیں۔ پھر برسات کی دم جھم اور سفید لباس میں لمبوس اس اجنبی کی شبیہ کے حقیقی دیدار کا اشتیاق گزشتہ ایک ہفتے سے نیندا ایک وہم کا نام تھی..... آج میں نے خواہ مخواہ رخصت لی۔ ویسے شام کو بھی جایا جا سکتا تھا۔ گھر میں بھی چھوٹ گھڑنا پڑا بڑی خاموشی کے ساتھ میں نے مطلوبہ بارہ لپٹی چائی مگر نگار نے پوچھ ہی لیا۔

”بابا کہاں؟“

اب میں اسے کیا جواب دیتا۔ پتہ نہیں مجھے کس کی تلاش ہے۔ کون سی تنگی ایک آوارگی کے لیے دیوانگی کی حد تک اکساتی ہے۔ ایک بے نام خلا زاد سفر ہے یہ کسی توفیق ہے؟ یہ سلسلہ ہے۔

اس بیچ سالہ سلسلے میں تمہاری مستقل اقامت گاہ کی میزبیاں چڑھتا اور اترتا رہا۔ ہر روز اہلی کے درخت کا سایہ ہم سفر ہوتا ہے۔ تمازت کا کیوڑ پھڑ پھڑاتا مگر غلیلی تنی ہی رہتی۔

مرکزی اقامت گاہ میں جو کچھ ہوا اس سے کون وابستہ ہوا ہے؟ میں سوچتا ہوں یہ تو ایک کھیل ہے لیکن تمہیں سلسلہ دکھائی دیتا ہے اور میں اسے سلسلہ کہنے پر مصر ہوں تو تمہیں سب کچھ کھیل لگتا ہے۔

گاؤں کے تنہا حجرے میں بوڑھا کہتا ہے۔

”اپنے آپ کو کم کر۔ اقامت گاہ تو ایک ہی ہے۔ جہاں کوئی گاہ نہیں۔“

تجارتیں ڈوبی ہوئی آواز میں انہیں جواب دیتا ہوں۔ ”جناب! کیا ہر سلسلہ تو

کھیل نہیں؟“ ●●

اندوختہ

”زندگی قرض ہے..... مگر اسے سود کے ساتھ کیوں چکا یا جائے؟“.....

آنکھیں اوپر اٹھائیں، کوئی نہ تھا، میرا وہم بھی نہیں۔ نساء تو کب کی جا چکی۔ تاج  
زیں کی دیوار پر ار جتا آرک کا سایہ اب بھی متحرک ہے۔ معمولی ہواؤں سے لپکنے والا۔ آج تو  
اوپر بڑی تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ نیچے کے جس سے تلک آ کر ہی میں نے سچت پر بستر لگوایا  
تھا۔ صبح سفر پر نکلنا ہے۔ بیگ میں تمام کاغذات سلسلہ سے رکھ دیے تھے۔

ان کاغذات ہی کے لیے ہی تو اتنا سب کچھ الٹ پلٹ ہوا تھا۔ عجیب بات  
ہے۔ ان کو جمع کرنے کے لیے کاوشیں اور چھٹکارا پانے کے لیے جدوجہد۔ میں نے کب ایسا  
چاہا تھا، بس اپنی چھوٹی سی من پسند زندگی گزارنا پانا ہی سب سے بڑا المیہ ہے..... اب تو  
اندوختہ سر ہانے رکھ لیا ہے۔ آسان پر چھتتاری پتیاں پھیل گئی تھیں۔ نویں رات کے چاند کی  
کرنوں اور تیز ہواؤں کی لہروں پر سوار اور ٹھکتی ہوئی تہی دہم سے بستر پر آگری۔ ار جتا آرک کا

سایہ شہر کی بیزار کن روڈ میں پر محیط ہو چکا تھا.....

متعلقہ کرہ میں نے اُن سے کہا:

”مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔“

”آپ کو شراکت کی نقل دے دی گئی تھی۔“

”میں نے اسے پڑھا نہیں۔“

”یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔“

”تو اب کوئی ایسی صورت نہیں کہ مجھے دوسری؟“

”آپ کے پاس کوئی تیسری ہے؟“

مجھے چھوکاراٹنے کی آس بندھی محسوس ہوئی۔ بیک کھولا اور کاغذ تیسرے خانے سے نکال کر ٹیبل

پر رکھ دیا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے میری طرف سرکا دیا۔

”آپ ایک ماہ سے پیچھے رہ گئے۔“

”یعنی.....؟“

”ہم تین سال کے بعد ہی غور کر سکتے ہیں۔“

”تو پھر.....؟“

”فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا..... ہاں ایک صورت ہے۔ آپ پہلی فہرست پھر

دوبارہ طلب کر سکتے ہیں اور اس کے عوض میں دوسری لے جا سکتے ہیں۔“

”یعنی پہلی آپ کے حوالے کرنا ہوگی.....؟ یہ تو.....“

”عجیب گورکھ دھندا ہے نا..... انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔“ عارضی

مشکل کو کٹ مت سمجھئے۔ تاریخیں یاد نہ رکھنے سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔“

میں نے کب الجھنیں چاہی تھیں۔ میں انہیں کیا بتاتا۔ سارا معاملہ ہی اپنے اختیار

میں نہ تھا۔ کیسی اٹھل پھٹل ہوئی تھی۔ زندگیوں کی ضمانت میں اپنے چھوٹے سے اصول کو ٹوٹنے

دیکھ کر..... یہاں اس دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ مجھے تو اس وقت بھی

جناب کی بات یاد آئی تھی۔

”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں جنت اتنی آسانی سے مل جائے گی۔ ابھی تو

ہم نے انہیں مال، اولاد اور عورت سے آزمایا نہیں ہے۔“

میں نے اپنا اندوختہ سنبھالا اور مزید کاغذات بیک میں ٹھونس کر بیڑھیاں اترنے

لگا۔ سورج اوپر آچکا تھا۔ پھاٹک سے ایک سنشن روڈ کی دونوں جانب ار جتا آرک کے سائے

جھلملا رہے تھے۔ مین روڈ پر ٹریفک شباب پر ہے۔ لیکن مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

بیک کھول کر شناخت نامہ اور وجہ ملاقات کی نوٹس دکھائی اور ہال میں داخل ہوا۔

انھوں نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کھڑکی کی سلاخیں ٹیبل پر ساریا لگن تھیں۔ لیکن تمازت کو

اے سی نے رخصت کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات سے نظریں

اٹھائیں اور مخاطب ہوئے۔

”اس ضمن میں ہمارے پاس کئی مراکز اور متعلقہ افراد سے شکایتیں ملی ہیں کہ.....“

”مگر وہ سب غلط ہیں۔“

”آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس ضمن میں جو فیروزہ مدداری آپ سے سرزد ہوئی ہے

اور جس کے نتیجے میں جو پریشانی اور نقصان ہوا ہے، اس کا محاسبہ کیا جانا ابھی باقی ہے۔“

”آپ کا مفروضہ صحیح نہیں ہے۔“

”ہمارا؟ اس باب میں اتھارٹی نے بھی سخت نوٹس لیا ہے جن میں کئی ماہرین بھی

شامل ہیں۔“

”عالم انہوں نے میرے Version سے اس کا تقابل ہی نہیں کیا ہے۔“  
وہ تو انجوائزی کمیٹی کرے گی مگر میں چوں کہ آپ سے..... تم سے اس حالت.....  
میرا مطلب ہے تم کسی ذہنی یا گھریلو مسئلہ میں الجھے ہوئے تھے؟“  
”ان سب باتوں کا اس سے کیا تعلق؟“

”ان دنوں مجھے تمہارے ہاں سے شادی کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اپنے کالج میٹ کے  
ہاں خوشی کے اس موقع پر شریک نہ ہونے کا افسوس بھی ہوا تھا۔ بہر حال مبارکباد۔“  
”شکریہ۔ اس نے بھی وداعی تقریب میں تمہیں یاد کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان دنوں  
میں بہت سرگرداں رہا۔ ساری دوڑ دھوپ مجھے ہی کرنی تھی۔“

”Look..... اس کا غمزہ پر اپنے دستخط کر دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”کیا ہے یہ؟“

”Apology Letter“

”مگر کیوں؟۔ میں نے کیا ہی کیا ہے؟“

”سوالات نصاب سے تجاوز کر گئے تھے۔ مگر میں نے اس لیٹر میں بڑی محنت اور  
ہوشیاری سے ایک Genuine Excuse کو شامل کیا ہے..... تم پڑھو تو سمجھی۔“  
میں نے کاغذ لے کر پڑھا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔  
”یہ غلط توضیح ہے۔ میں اپنے گھریلو مسائل اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو الگ الگ  
خانوں میں رکھتا ہوں۔“

”میری بات مانو۔ زندگی میں Compromise سب سے بڑی قدر ہے۔“

”Absolutely not, I shal face the enquiry“ کا نڈلوتا ہے

ہوئے میں سیٹ سے اٹھا۔ سوچنے لگا۔ ”کیا واقعی اصولوں کے ٹوٹنے میں اللہ ہی کار سازی  
کرتا ہے؟ ایسی رائے قائم کرنے میں کتنی راحت ہے۔“  
باہر نکلا تو سورج سر پر آچکا تھا۔ سامنے لان میں ار جٹا آرک کے سائے سرنگوں  
ہو گئے تھے۔

”سپرٹنڈنٹ صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔“ چاروٹا چار جانا ہی پڑا۔

”بعد مدت حضور کے درشن ہو رہے ہیں۔ اپنے احوال ہمیں بھی تو سنائیے۔“

”کام کی بات کرو۔ مجھے جلدی ہے۔“

”بس وحید صاحب آپ کو ہر معاملہ میں جلدی ہوتی ہے مگر جو تھوہم آپ کو عنایت

کرنے.....“

”تھوہ؟ کیسا تھوہ؟“

”نساء کا مارکس کارڈ۔“

”مگر اس نے امتحان ہی نہیں دیا تو مارکس کارڈ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”کیا خوب..... اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا۔ اس کا غمزہ پر اپنا نام  
پتہ اور دستخط اگرچہ یہ قواعد کے خلاف ہے مگر ہم ٹھہرے محبت کے دیوانے..... آپ کا  
خیال تو رکھتا ہی پڑتا ہے..... یہ ہمارا کس کارڈ..... مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نامہ  
برکوش.....“

میں نے حیرت سے کارڈ لیا اور کھو گیا.....

زم زم چوراہے پر ہم دونوں کی زم زم دیدہ بازی ہوتی۔ نساء روٹ 4 پر سفر کرتی اور

میری کوئی روٹ مقرر نہ تھی۔ اس کی چوکیداری میں زمانے بھر کا لطف تھا۔ میں اسے خوب صورت تو نہیں کہہ سکتا مگر اسے دیکھتے ہی مجھے اپنی ماں کا چہرہ یاد آتا..... عجب مبتا بھرا چہرہ..... نور سے بھرا گورا رنگ بڑی بڑی گول آنکھیں جن میں آسمان کی نیلاہٹ منعکس ہوتی۔ سراپا ایسا کہ سمجھنے لینے سے زیادہ چھونے میں سرور آئے۔ ہم دونوں کی عمروں میں تفاوت تھا۔ اس میں استقلال کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور میں پارہ نصیب۔ کئی ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح تین ماہ پہلے فسادات کے بعد پولیس نے شہر کے اسی چوراہے پر اس کے بڑے بھائی کو گھیر کر گولیوں سے بھون دیا اور بعد میں اسے انکاؤنٹر کا نام دے دیا..... وہ مجھ سے کسی قسم کا مطالبہ نہ کرتی بلکہ بات بھی کم ہی کرتی، مگر میں اپنے طور پر اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ مختلف قسم کے فارم بھردینا، پرائیکٹیل ریکارڈ بک میں شکلیں اُتارنا، لائبریری سے کتابیں لانا، بس پاس کے لیے دوڑ لگانا..... اور اس کی ایسی سب ضرورتیں پوری کرنے میں مجھے عجیب سی مسرت ملتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ سب کچھ بدل گیا۔ ایک آدمی کی روزمرہ تبدیلیوں میں یا تو اسے بیوی مل جاتی ہے یا نوکری..... زمانہ گزر گیا.....

نساء کی خبری نہیں ملی بلکہ میں نے جاننے کی کوشش بھی شاید نہیں کی تھی.....

ایک دن: نواب جلال خاں صاحب کی نوٹس آئی۔ وہ ہماری سابقہ جاگیر کے متوقع جائین تھے مگر پولیس ایکشن کے باعث وہ اپنے حق تواریث سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کے والد نواب سید احتشام خان صاحب کو بھی بڑی حکمت عملی سے والی جاگیر بنایا گیا تھا۔ ان کے والد سید کریم خاں صاحب کی اور جاگیر داروں کی طرح چار بیویوں کے علاوہ بیسیوں کنیزیں تھیں، انھوں نے حسب دستور اپنے بڑے فرزند نواب سید رضی خاں کو اپنا جائین مقرر کیا اور اس کی توثیق والی ریاست سے بھی حاصل کرائی گئی تھی۔

نواب رضی کو کشتی رانی کا شوق تھا۔ ایک شام وہ اپنے مصاحبوں اور محبوبوں کے ہم راہ جاگیر کے دریا میں کشتی رانی کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ اچانک کشتی ڈوب گئی۔ ایک ماہر تیراک کے علاوہ سب ڈوب گئے۔ تیراک نے نواب کو بچانے کی کوشش کی مگر وہی یہ خبر سنانے کے لیے زندہ رہا۔ بعد ازاں نواب احتشام کو حسب دستور والی جاگیر بنانا پڑا۔ نواب صاحب نے ماہر تیراک کو اس کی خدمات کے عوض کئی ایکڑ زمین انعام میں عطا کی..... پولیس ایکشن میں نواب احتشام کو کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ ان کی خون میں تھمزی لاش کے اطراف کاغذات کا انبار تھا۔ خون سے سنی ٹمھی سے کاغذات کو بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ جاگیر ختم ہوئی۔ ریاست ٹوٹ گئی۔ اثاثے لوٹے گئے۔ عورتیں غائب ہوئیں۔ اس پر آشوب دور کے پانچ سال بعد نواب سید جلال خاں صاحب سابقہ ریاست کی راجدھانی حیدرآباد سے اپنی آبائی جاگیر تشریف لائے اور اپنی جاگیر کی باقیات کے حصول میں جٹ گئے۔

نواب سید جلال خان نے شانہ روز کی محنت سے اپنی سابقہ جاگیر کے ریکارڈ جمع کیے۔ ان کا ریکارڈ روم ان کی محنت شاقہ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے..... نواب نے اپنے محلات میں کئی اسکول اور کالج قائم کیے اور اس طرح ان عمارات کے تحفظ کا بندوبست کر لیا اور نہ موجودہ حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ کو ان عمارات میں اپنے دفاتر اور میوزیم قائم کرنے کی عجلت تھی۔ نواب نے اپنا ٹرسٹ قائم کیا۔ ایک سیکولر پارٹی کے چھنڈے تلے ایکشن لڑا اور شہر کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ محرم کے قہریے پھر سے دھوم دھام سے نکلنے لگے۔ صوفیوں کے تارک الدنیا حجروں میں سماع کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ عرس اور سالانہ مشاعرے جاگ اُٹھے۔ ایسا فعال نواب میرے دیکھنے میں کم ہی آیا۔ انھوں نے مجھے اپنے تعلیمی اداروں کا سیکرٹری مقرر کیا۔ ان کی وہ نوٹس ٹیچرس کے تقررات کے باب میں تھی.....

انٹرویو میں نساء کو ایک مدت بعد دیکھا۔ نواب نے میرے کچھ کہنے سے قبل ہی نساء کا تقرر کر دیا۔ اب پھر وہی دیوانگی..... میں طرح طرح کے بہانوں سے نساء کے آگے پیچھے سرگرداں رہا۔ میرے لیے یہ نئی بات تھی کہ نواب موصوف بھی اسکول پر مسلسل حاضری دینے لگے۔ نساء نے ایک دن اپنے اندیشے کا اظہار بھی کیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور تحفظ کا احساس بھی دلا یا مگر اس نے ایک سال کے اندر ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ میں نواب صاحب کے پاس طیش کے عالم میں پہنچا۔

”نواب صاحب یہ سب کیوں ہوا؟“

”وہ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔“

”آپ بڑی خراب مثال قائم کر رہے ہیں۔“

”وہ ہماری جاگیر ہے۔“ نواب نے کہا ”اور جو کوئی ہمارے اس حق کے سچ آتا ہے،

ہم اسے غائب کر دیتے ہیں۔“

میں نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا مگر انہوں نے مجھے برطرف کیے جانے کا پیغام بھیجا۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ نساء کی کوئی خبر نہیں تھی بلکہ میں نے شاید جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی..... اور اب یہ مارکس کارڈ!

میں کارڈ کو اپنے اندوختہ میں رکھتے ہوئے جب عمارت سے باہر نکلا تو ار جتنا آرک کے سامنے طویل ہو گئے تھے۔

وہی دور دیے گئی..... مگر بہت کچھ بدل بھی گیا تھا۔ چراغ مسجد کی ریٹنگ کے

سہارے دور تک جانے والی گلی Upper Lane اور ریٹنگ سے نیچے دور تک جانے والی گلی

Lower Lane کہلاتی تھی۔ اب دونوں جگہوں پر کولتاری سڑک لگیوں کی آخری سرے تک

دکھائی دے رہی تھی۔ جگہ جگہ بڑی بڑی عمارتوں نے سر اٹھا رکھے ہیں۔ مجھے یاد تھا۔ تھوڑی ہی دور ار جتنا آرک کا طویل درخت اور اس سے متصل پتلی گلی میں نساء کا مکان ہے..... میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شام پوری طرح پھیل چکی تھی۔

”آپ کا نام“..... ایک دس گیارہ سال کا لڑکا مجھ سے ہم کلام تھا۔ اس کی نظریں میرے بیگ پر لگی تھیں۔

میں نے اپنا نام بتایا۔

لڑکا چونکا اور تھوڑا سا مسکرایا۔

”آپ جاگیر سے آرہے ہیں؟ نواب انکل کیوں نہیں آئے؟ آپ ان کا پیغام لائے ہیں؟“

لڑکا پارہ صفت لگا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ بھی می کے کالج میں پڑھاتے ہیں یا پاپا کے دوست ہیں؟“

میرے جواب سے پہلے ہی دروازے کا دوسرا پٹ کھلا۔ نساء کے چہرہ پر حیرت آمیز مسرت تھی۔ وہی سراپا..... میک اپ سے عاری چہرہ۔ بالوں میں دو سفید پٹیاں فوری طور پر متوجہ کرتی تھیں۔ میں اس کے بلانے پر کمرہ میں داخل ہوا۔ ایک لائے میز پر چائے کی پیالیاں بکٹ اور فرٹ بکھرے پڑے تھے۔

میں نے اپنا بیگ کھولا اور اوپر ہی خانہ سے اس کا مارکس کارڈ نکالا۔

”مبارکباد۔“

کارڈ پر نظریں گاڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ”آج میرے لیے خوشیوں کا دن

ہے۔“ پھر بولی۔ ”آج ہی میرا Promotion بھی ہوا ہے۔ نواب صاحب نے زبردستی یہ پارٹی ارجح کروائی تھی مگر وہ..... ابھی تک نہیں آئے؟“  
میں کچھ بھی کہہ نہ سکا۔

وہ میری خاطر مدارت میں ادھر ادھر اندر باہر ہوتی رہی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔  
پچھلے دروازے پر بلکی سی آہٹ کے ساتھ ہی اس نے کہا۔  
”غالبا نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔“  
میں نے رخصت چاہی۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ دروازے پر اس نے  
مجھے غور سے دیکھا اور ایک چٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔  
”اسے گھر پر پڑھیے گا۔“

میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ کسی اور کمرہ سے لڑکے کے ہنسنے کی آواز میرا پیچھا کرتی  
رہی۔ رات کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ ار جتا آرک دھندلا گیا تھا۔ مسجد کے گھن میں لگے  
لائٹ پول میں، ریٹنگ کا سہارا لیے میں نے کانٹھ کھولا اور پڑھنے لگا۔  
”جناب۔ آپ نے مجھے ہمیشہ خوشیاں پہنچائی ہیں۔ مگر آپ سے ایک گلہ ہے۔“  
آپ نے، اپنے ہاں کی شادی میں مجھے یاد نہ کیا۔ نواب صاحب سے مجھے اس کی اطلاع ملی  
تھی۔ کتنا بدل گیا ہے وہ شخص۔ مجھے کبھی کبھی تو یہ احساس ہونے لگتا کہ کہیں آپ کی روح تو ان  
میں نہیں ساگئی؟ آپ نے ان دنوں مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا زندگی محض جنگ ہی نہیں صلح  
بھی ہے۔ نواب صاحب نے وقت سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ آج مجھے احساس ہوتا ہے، ان کی  
رعونت ان کی پڑمردہ شگستگی کا رد عمل تھی۔ گھر میں سب کو سلام کہیے گا۔ بیٹی کو ڈھیروں پیار اور  
دعائیں۔ کیا وہ آپ کے ہاں آئی ہے یا سرال میں ہے؟ نساء۔

”نوٹ۔ طارق سے آپ کے آنے کا ذکر کروں گی۔ طارق وحید کے لٹو کا نام  
ہے۔“

مجھے گول گول گہری آنکھوں سے آسمان کی سی نیلا ہٹ فضا میں منعکس ہوتی ہوئی  
محسوس ہوئی.....

آسمان ابھی دھندلا تھا۔ میں نے اپنی سب چیزیں سمیٹیں۔ اندوختہ سنبھالا۔ لائٹ  
آف کی۔ میں وقت پر جاگ گیا تھا۔ بیڑھیوں سے اتر، ہاتھ منہ دھویا، لباس تبدیل کیا اور  
بیگ سنبھالتا دروازہ کی طرف بڑھا۔ صبح ہو چکی تھی۔  
”بابا کب تک لوٹیں گے؟“ پیچھے سے نساء کی آواز آئی۔ میں نے بغیر مڑے جواب  
دیا۔ ”شام تک۔“ ●●



## زوالِ رفت میں پچھلی دُھند

(قمر احسن کے نام)

ستوط شب، ہاں ہاں بچی۔

اب میں تم سے بہت بہت ہی دور، ستوط شب کے زوال میں بہت تیز چبھتے لال سنگ ریزوں سے لاپرواہ، قریب سے قریب تر، جو رہا ہوں۔ وہاں کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

ہاں ستوط شب کا داستانی حصار تمہاری مسکراتی آنکھوں سے طلوع ہوا تھا۔ کیسا عجیب

تماہہ؟

پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس طرح اس عدم خود کار جھولے میں بیچکولے لیتا سب سے اوپر پنگوڑے میں پہنچا۔ اس چکر پر میرا اختیار کب تھا۔ میں نے زمین دیکھنے میں بہت سی جدوجہدیں کیں مگر تماہ کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ گھنگورا آسان پر سورج بھی آنکھ چھوٹی میں غملاں۔

اطراف نظریں دوڑائیں تو محسوس ہوا کہ شاہ علی ہنڈہ یا آغا پورہ کا محل وقوع ہے۔ اطمینان کی سانس بھی لینے نہ پایا تھا کہ جھولا پھر سے حرکت میں آ گیا اور میں نیچے ہی نیچے اور بہت بہت ہی نیچے آتا رہا۔ سارا محل وقوع اوجھل ہوتا گیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک وسیع و عریض فولاد کی ٹینکی میں اتر رہا ہوں۔ اوپر کے سارے منظر قائب۔ سخت سفید اور شفاف سطح کے کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ آخر کار پنگوڑا، چند ہی انچ اوپر سخت دھات نما سطح پر جھولتا رہا۔ ٹینکی کے اوپر کونوں اور دیواروں سے عزیز احباب کی نرم گرم آوازیں ابھرتی رہیں۔ عجب دھات نما آوازیں، مجھے یاد آیا۔ جب دیہات کے عرس میں تمہارے انتظار سے اکتا جاتا تو بلا تاخیر جھولے سے اتر جاتا سانسے راستے کے چڑھاؤ کے نیچے آوازیں کی ہستی میں تمہارے وجود کا سنا تا میرے دل میں اترتا رہتا اور یہاں۔ اطراف چٹیلے کے پھولوں کے گھرے اور رس بھری آوازیں گونج رہی تھیں۔ تمہیں یاد ہے ایسے ہی ایک موقع پر تم نے پھولوں کو ترجیح دی تھی.... پھر یہ کیسے ہوا۔ کیوں؟ اس عدم خود کار جھولے پر کسی کا بھی اختیار نہیں۔ مجھے جب اوپر لایا گیا تو میرا دوست ٹنگلی لگائے مجھے ہی گھور رہا تھا۔ آج کل وہ کسی شعبہ میں سیکیورٹی کام پر متعین ہے اس نے مجھے کھینچا۔

”میرا دل ڈوب رہا ہے۔“

جسم پر بڑی تھکن تھی۔ مجھ کو باور کرایا گیا کہ اس حصار آسائش کے بعد میں بالکل بیمار ہو چکا ہوں۔ آسمان پر سورج اپنا غسل آتار بدن پونچھے میں مصروف تھا۔ ایک شخص جو سابق میں مشہور فریڈین اور اب روحانی علاج کی طرف راغب ہے میرا معائنہ کرتا رہا بعد ازاں اس نے مجھے کچھ تصاویر دکھلائیں۔ ہر سے بھرے کھیت، ٹوٹے مکان، انار کے درخت سے نکلتا ہوا دھواں، کچھ آن کچھ نفوش، زرد چہرہ، لال مٹی..... نسخہ کی چٹھی میرے دوست کے

حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا ”نی الحال کسی آزاد پرندہ کا جوڑا نہیں دکھلائیے۔ حصار کی گہرائی نے ان سے ان کا عمل وقوع گم کر دیا ہے۔“

کیسا عجیب تھا وہ داستان حصار، تمھاری مسکراتی آنکھوں سے طلوع ہوتا ہوا۔ میری روح پر اس کے غروب ہونے کی داستان ”میں یہ سب تمھیں سن رہا ہوں۔ سنی ہوتا۔“

میں نے ہلکی تمنازت والی صبحوں میں آوازیں دیں مگر پانی پر سفر کرتے سایہ کو مقید کرنے کے لیے کون سا جال میرے پاس تھا..... اور وہ اپریل کی چودہ تاریخ تھی۔

شروع شروع میں میں نے تمھارے راستوں پر کتنے قسم کے پھول کھرائے تھے۔

ان پھولوں کے حصول میں آواگی میری واحد سرگرمی تھی۔ نیلے مہربان آسمان کے نیچے، درگاہ سے کتنی دور تھا وہ مکان، تمھارا مکان، سیاہ گول گول آنکھوں کے بیچ منتظر فاصلوں کی صبحوں میں سفید پھولوں کی خوشبو انتظار کی آخری کمین گاہ تھی۔ یہاں تک کہ تمھارا دروازہ آجاتا۔ وہاں کیا

تھا۔ ”حصار۔“ ایک دن کاروباری رواج کا لالچ کھولتے ہوئے دکھائی دیا۔ ”آدی کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ عورت کی بجائے میدانوں میں نکل جائے۔“

تم نے میرے جواب کو نیم غنودگی میں سنا۔ میں نے ہلکے، دھیرے دھیرے اور نرم انداز سے تمھارے چہرے سے تریہ تر زلفوں کو ہٹایا۔ ماحول بڑا جاگا جاگا سا محسوس ہوا۔ سامنے

ادھ کھلی کھڑکی ہے۔ دائیں جانب دور درگاہ کے کلفنی نمائش میں سبز روشنی، جھگی تھکی بارش، انار کے درخت میں شعلے بھر رہی تھی اور دور چاند ڈول رہا تھا۔ میں نے تمھارے نرم اور گداز جسم کو

ہلکی سی کپکپاہٹ کے ساتھ سخت ہوتا محسوس کیا۔

”عرفانہ!“

”کیا؟ یہ کیا نام؟“ ایک سوالیہ وجود۔ سیاہ نرم بالوں میں بچھرتا چاند۔

”..... نام،“ مولسری کے درخت کی سمت دھواں اُچھالتے ہوئے اس سبز عبا پوش فقیر نے جواب دیا..... سن چھو کرے۔ اللہ۔ اٹلیس۔ آدم گٹھ..... تینوں کا بس ایک ہی مٹھ“

”میں نے ایک خواب دیکھا ہے؟“

”کب؟“

”کوئی چھ روز پہلے..... شاید نو اپریل کی صبح۔“

..... تو ہوا یہ کہ دن پوری طرح روشن تھا میں اپنے کھیتوں میں حیران سرگرداں،

چاروں طرف نظریں دوڑائیں جام کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کل شام ہی تو ہزاروں جام گنے جا چکے تھے۔ اب کے اور کوئی ان ہوتی وہا۔ میرے دل میں وہی خوف ابھر

آیا۔ میں نے سامنے دیکھا دھند میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہی جو ہمیشہ سے میرے تعاقب میں چکراتا رہتا ہے۔ عدم خود کار۔ میں نے اپنے کالے کرتے کی جیب میں شجرہ اطاعت کی

سربراہت محسوس کی۔ کس قدر اچھی حالت میں تھا وہ۔ پرسوں شام جب حساس جائے واردات پر، بے تحاشہ جام لندھانے کی پاداش میں وہ سب میرے خلاف نکل پھا رہے تھے۔ تب

آڈیو ریم میں کوئی بھی میری داستان سننے کو تیار نہ تھا۔ ایک مسخرہ نے اپنے کرتب نما کارنامے سے مجھے بچا لیا۔ آڈیو ریم میں قہقہے گونجتے رہے۔

کالے گھوڑے پر سوار میں ہوا سے باتیں کرتا رہا۔ ایک حصار سے نکل کر میں موٹے موٹے سرخ منکوں والوں کے بیچ داستان سمجھانے پر مامور ہوا۔ وہیں تم نے مجھے اپنی گول گول

آنکھوں سے داستان حصار کا اولین سبق دیا۔ ہر شام کالے گھوڑا میرا مولس تھا۔ براہوں دن کا کہ مندر کے عقب میں ایک تالاب ہوا کرتا تھا میں نے باگ کھینچتے ہوئے حالاں کہ اس سے

درخواست کی کہ وہ کم از کم چند چمنوں کے لیے سہی اپنے آپ کو گردن تک ڈبوئے رکھے مگر وہ تن کر، بدستور اپنے اشتعال انگیز عریاں سینے کے ساتھ ایسے ہی کھڑی رہی اور یوں نشر اس کے بدن میں موجزن ہونے پر راضی ہوا۔ سائل کی کنکر بلی ریت پر جب میرے جسم پر..... منکوں والوں کے ڈنڈے برسنے لگے تب سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہوش آیا تو سبز عبا پوش فقیر نے داستان کو توڑتے ہوئے ایک نئی منزل کی طرف اشارہ کیا۔

”اپنے کفر کی شہادت سالک کے مسلک کا آخری وقوع ہے۔“

پشیمانی کا اطمینان ہوا تو میں ان سے بھاگنا نہ چاہا۔ ہم راہ چلتے چلتے جب ہم اشارہ گاہ تک پہنچے تو طویل لاکھود حصار کے بیچ وہ ایسا دہشتہ تھا۔ دودھیازمانہ نے اس سنگی عمارت پر کیسے کیسے نشان ثبت کر رکھے تھے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ آسمان صاف اور زمین پر دور دور تک کسی سائے کا نام و نشان نہ تھا۔ دروازے کے چوکھٹے میں ایک نیم شکنیہ تختی پیوست تھی۔ ”فان منزل“ بقیہ حصہ پتہ نہیں کہاں کھو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اندر داخل ہوا اور ایک سردی کا احساس غالب ہوا۔ لاکھود ستون، عمارت کا اختتام نظروں سے اوجھل ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

”یہی ہے وہ دائرہ نما کتواں جو نویں ستون کے بائیں طرف واقع ہے۔“

صاف شفاف پانی یوں موسم اور سفر نے میری آنکھوں میں شدید لاکھلی کا فیض منعکس کر دیا تھا۔ میں نے اندر جھانکتے ہوئے بے اختیار کہا۔

”صرف تین ہی چھلیاں!!!“

”جب کوئی حصار نہ تھا تو کہاں تھا؟“ اس نے جواب میں کہا۔

”مٹھے..... گٹھے.....“

..... تو تمہیں چھ دن بعد خیال آیا کہ خواب سنایا جائے۔ کیا خواب تھا وہ۔ اس کے لہجے میں حد درجہ استفہام تھا۔

”میں بہت پہلے سے اس خدشہ میں مبتلا رہی ہوں کہ آخر کار یہ بوڑھے فقیر اور وہ سب تمہیں ذہنی طور میں گرفتار کر دیں گے۔“

میری بانہوں کے حلقہ سے آزاد ہوتے ہوئے اس نے جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”میں خواب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں اور تم جواب دیتے ہو، اس ادھ کی کھڑکی کے باہر ایک سنگین حصار ہمارا منتظر ہے؟ وہ یک بہ یک کھڑی ہوگئی۔ میں نے اپنی تڑپ ترقیوں کو دیکھا۔ آج میں کافی سیر کر چکا تھا دراصل کوئی بھی سیدھی اونچی نوکیلی شے مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے۔

حالاں کہ ابھی کوئی زیادہ فاصلہ طے نہیں ہوا تھا۔ سرما کا موسم اور کولتار کی ٹھنڈی مرکز دور دور پھیلی ہوئی نیم نمونصعلیں اور ان کے بیچ سویا ہوا نیم بے ہوش پانی اطراف کی سب بادلیاں کھارے پانی کی تھیں۔ صرف پیچھے، کچی مرکز سے متصل ”کھلے سر کی باؤلی“ مٹھے پانی کے لیے مشہور تھی۔ سامنے سرخ رنگ کی اونچی نوکیلی سیدھی مختصر سی پہاڑی، ایک نظر میں ایسا محسوس ہوتا کہ زمین نے اپنا بھیا تک روپ اس پہاڑی میں منعکس کر دیا ہو۔

”میری عمر تم سے کوئی چالیس سال زائد ہے، پھر بھی زمین کی یہ سرخی کس ہولناک تجربہ کی نشانی ہے۔ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں میں نے ذرا آگے جا کر ان کی بات سنی۔

اب آسمان کی تمازت کا جال دھیرے دھیرے کھل رہا تھا پھر بھی انہوں نے اب تک اپنے دونوں ہاتھ جینٹ میں چھپا رکھے تھے۔ دور تک کسان لال زمین کے کھیتوں میں جبراً آئیز مشقت میں سرگرداں، آسمان پر نیلی نیلی شعاعوں کا مونٹاڑ پہاڑی کے عقب سے سارے

ماحول پر محیط ہو گیا تھا۔ خالق کی فن کاری کا حصار جیسے سب پر محیط۔

”ہو سکتا ہے وہ تمام واقعی خطرناک خدائر ہے ہوں جنہیں اس پہاڑی کے اوپر ہاتھ کر توپ سے اڑا دیا جاتا تھا۔ عبرت کے لیے..... سقوط شب کی اولین ساعتوں میں، جب سورج اپنی آنکھیں اس زمین پر کھولتا ہوگا تب اس سرخ پہاڑی کے اوپر فضا میں اچھلتے سرخ سرخ جسم کے گلوے سارے منظر کو روح فرسا بناتے ہوں گے۔“

”خدارا“ یہ لفظ تو آدم کا سایہ ہے۔ تم بھی کیا اہل تخت کی طرح یہی سمجھتے ہو کہ پہاڑی اٹل ہے۔ نہیں۔ نئی حکایتیں اپنے معانی خود ساتھ لاتی ہیں۔ یہ سب اس کا کھیل ہے کہ وہ خود زمانہ ہے۔“

زمانہ..... میں نے وحیانا انداز سے اس کی سرخیاں چوسیں۔ اُف تم نے ابھی ابھی چراغ جلا یا تھا مگر تمہارے جسم سے نکلتی روشنی میں اپنی روح کے اندھیرے کے ساتھ تمہارے اندر گوشہ نشین ہوں۔ خوف ناک سیاہ رنگین حصار تمہارے اس بوسیدہ دروازے کے باہر میرا منتظر ہے۔ تم چاہو تو اس حصار کو توڑے ہم آوارہ آزاد کھل جائیں۔ سفر لمبا نہیں اور تب تمہیں زمانہ کا احساس قطعاً نہیں ہوگا۔

”ٹھیک ہے۔“ یوں اس لمحہ ہم دونوں اس بھورے پتھر پر بیٹھے ایک ساتھ سرخ پہاڑی کے وقوع پر باتیں کر رہے ہیں مگر صاف سیدھی صاف حقیقت یہ ہے کہ اس بھورے پتھر کو جھ سے پہلے آپ نے دیکھا ہے۔ گرما کی انتہائی سرد راتوں بارش کی دہشت ناک دھوپ اور سرما کی بگولہ اڑاتی شاموں میں..... اور یہ سب تجربہ ہیں۔“ مرالہ جملہ آورتھا۔

”تم غالباً عمر کی بات کر رہے ہو۔“ انہوں نے ایک تیز جاتی ہوئی کار پر اپنی نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میں نے اس بھورے پتھر کو آج

ہی دیکھا ہے تو کیا اس کا وجود مشکوک ہو جائے گا؟ اور ہماری عمر محض گمان نہیں۔ وقت کا انسلاک ہم سے ہے اور ہم سے ہٹ کر وہ عدم ہے۔“

”میں سمجھا نہیں“

تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کل جمعہ ہے۔ ٹھیک ہے۔ اگر انسلاک وقت کی حقیقت بس اتنی ہے کہ آج جمعرات ہے تو میرا اور تمہارا اس بھورے پتھر پر بحث کرنا لایتنی ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں سرخ پہاڑی پر جماتے ہوئے کہا۔ ”میں جس گاؤں میں تھا وہاں کے لوگ اس عالم دیران میں بس دو ہی کام کرتے تھے، باڈلیاں کھودتے اور نانج اُگاتے۔ اچانک ایک صبح ہم نے دیکھا کہ ہمارے گاؤں، کھیتوں، جمبوئیوں اور سرگرمیوں کو ایک زبردست غمیش و فغضب ڈھاتی ندی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔“ وہ کھوسے گئے۔

”تو کیا ہوا؟“ ”میں یہ سمجھوں کہ عمر حادثاتی مناظر کو بھی پر اسرار ڈھنگ سے پیش کرنے کا فن سکھا دیتی ہے۔“ میں نے انتہائی تسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

”لیکن میں سوچتا ہوں کہ گاؤں حادثہ ہے یا ندی۔ یادوں کا ملبا، مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندی نے اپنے پتھر سے ہونے والی گاؤں کو آخر کار دریافت کر لیا ہے۔“

”تم کو تو بس بے لگی باتیں کہنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ تم چراغ پا ہو گئیں۔“

”تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں لوگوں سے یہ کہتا پھروں کہ لوگوں کی سفید ریشمی پر مت جاؤ اسے تو اس نے بس یہ طور بزرگی رکھ چھوڑا ہے۔“

”مگر..... مگر آپ دونوں کا ساتھ ساتھ کھومنا پھرنا، خواہ تنواہ لوگوں میں چہ میگوئیاں پیدا کر رہا ہے۔ باہا تو خیر معصوم ہیں۔“

”لوگ“ ”میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بالآخر وہ تمہارے بوسیدہ دروازے کو ٹھوکر

مارتے ہوئے اندر آچکا تھا اور تمھاری مسکراتی آنکھوں کو روندتا ہوا مجھ پر مسلط ہو گیا۔ تم نے ستویں شب کی اولین ساعتوں میں مجھے ہر قید سے آزاد کیا تھا۔ اب میں تم سے بہت دور نناک سرد سحر کے لہجوں میں سرخ اونچی سیدی اور نوکیلی پہاڑی پر گامزن ہوں۔ میرے عقب میں لہجہ پہلچہ حملہ آور ہوتے ہوئے سنگین حصار کے ہاتھوں میں فرمان ہے اور نیچے طویل میدان، میدان سے پرے کوئٹہ کی سڑک سے بائیں جانب تمھارا ٹوٹا مکان اور دائیں جانب دور درگاہ کا لمبا سایہ اور وہاں سے تھوڑی دور اونچائی پر سرخ پہاڑی کو گھورتا ہوا توپ کا دہانہ۔ ●●

## چچی

منظر: تاریکی

(پردہ اٹھتا ہے)

اسٹیج تاریک ہے..... 30 سیکنڈ بعد روشنی اسٹیج پر پھیل جاتی ہے۔ منظر واضح

ہوتا ہے۔

میدان

میدان کے وسطی خط پر، دائیں طرف ایک درخت ہے: بوڑھا، ہرا بھرا۔ پیڑ سے تقریباً دو گز کے فاصلہ پر ایک جوہڑ ہے: گندہ، گدلا گدلا، درخت قریب قریب ستر کا زاویہ بنائے زمین کی جانب اس قدر خم رسیدہ ہے کہ اس کے سنے کا پیش تر حصہ اور ابتدائی

شاخیں، قبر کے اوپر، اور شاخوں کا بیش تر حصہ اور ڈالیاں جو بڑی جانب جھکی ہوئی ہیں۔

میدان کے کنارے بائیں سمت ایک الکنزک پول ایسا وہ ہے۔ چمک دار پول کی سطح کو سفید چمک دار پینٹ سے روشن کیا گیا ہے۔ پول کے اوپری حصہ میں غالباً ساٹھ کینڈل پاور بلب روشن ہے اور اوپر ہی کے آخری سرے پر چار الکنزک تارا جھل بائیں سمت سے آکر ختم ہو گئے ہیں۔ نیچے کے حصہ میں پول سے ہٹ کر ایک شخص اپنی پیٹھ اسٹیج کی سمت کیے کھڑا ہے۔ اس کی پیشانی چمک دار پول کی سطح سے لگی ہے۔

میدان کی مٹی کالی

پس منظر میں آسمان اگلا، شانست۔

وہ شخص پلٹا ہے۔ یہ ایک نوجوان ہے، عمر بچپن کے اوپر جا چکی ہے۔ سانولا رنگ، ستواں ناک، ویراں آنکھیں اور جسم دہلا پتلا، اس کے سر پر ہرے رنگ کی گاندھی ٹوپی اور بدن پر سفید رنگ کا کوئی جدید کوٹ اور گیسوے رنگ کی دھوتی ہے۔ پیروں میں جو تاجپل ندراد۔

نوجوان تھکے تھکے انداز میں، پول سے ہٹ کر درخت کی سمت آگے کو آتا ہے، قریب رک کر اپنی دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر ٹکائے سر جھکائے، آنکھیں اوپر کیے، درخت کو تاکتا ہے..... اس کی آنکھوں سے فکر مندی جھلک اٹھتی ہے..... اپنے دائیں آنکھوٹھے کو کینٹی پر دبائے وہ ایک قدم آگے کو بڑھتا ہے اور کوٹ کی چلی بائیں جیب سے ایک چاقو نکالتا ہے۔ چاقو کے دستے کو اپنی مٹھی میں بھینچے، جھکا ہوا، کچھ دیر کسی انجانے عمل کو توقف دیتا ہے۔ اس کی پیشانی پر ۷ دوائی نمار گیس تھی ہوئی ہیں، تھوڑا سا کھڑا ہو کر وہ درخت کی بوڑھی کھال چھلانا شروع کر دیتا ہے۔ اس عمل میں وہ انتہائی منہمک ہے۔ درخت کی چھال اس کے پیروں کے قریب گرتی جا رہی ہے..... اچانک ہی اچھل کر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے اس

حصہ کی طرف دیکھتا ہے جہاں سے اس نے چھال ادا پیری ہے۔ اس کی آنکھوں سے پہلے مایوسی اور پھر خوف اُبھرتا ہے۔ ادا پیرے ہوئے درخت کے حصہ میں..... دیمک کے اثرات نظر آتے ہیں..... وہ پیچھے ہٹتا ہے اور شکستہ میز سے ٹکرا کر گرتا ہے۔ کانپتے کانپتے اٹھ کر قبر کے بائیں کنارے اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو بائیں سمت آگے جھکائے شاخوں کو اوپر ہی اوپر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ شاخیں اپنا اصل تناؤ کھونے کو ہیں۔ تب ہی جانے کس خیال سے وہ اچانک شاخوں کو ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے شاخوں کی زد سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ ایک نجیف جھلا نگ بائیں سمت لگاتا ہے مگر بھسل کر جو بڑ میں گر جاتا ہے۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے لباس پر دھبے آگئے ہیں اور چہرے پر بڑا معنی سکر امٹ..... اب وہ پول کی سمت ہارے ہوئے انداز میں بڑھ رہا ہے۔ پول کے قریب نیچے جھک کر وہ اپنے ہاتھ زمین سے رگڑتا ہے اور تھوڑی سی مٹی لے کر دونوں ہتھیلیوں پر ملتا ہے۔ پھر وہ پول پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوبارہ بھسلتا ہے مگر اس کے پیر زمین سے اوپر ہی رک جاتے ہیں..... آخر کار وہ بلب کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بلب کی جانب اپنا دایاں ہاتھ بڑھائے اسے علاحدہ کرنے کے لیے کسمپاسا ہے مگر فوراً ہی اپنا ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ کوٹ کی چلی جیب سے ایک ٹیالے رنگ کا رومال نکالتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پول تھامے دائیں ہاتھ میں رومال لیے بلب نکال لیتا ہے۔ پول سے بھسلتا ہے اور آہستگی کے ساتھ پاؤں زمین پر ٹک جاتے ہیں۔ رومال پول کے قریب زمین پر پڑا ہے..... وہ دم لے رہا ہے۔ اس کے چہرے پر نامعلوم جوش دکھائی پڑتا ہے۔ اب وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا قبر کی طرف جاتا ہے..... شکستہ قبر کی واضح دراڑ میں بلب کو ڈال دیتا ہے اور اطمینان سے جو بڑ کے قریب آئے، اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ دھو لیتا ہے..... گیلا چہرہ گیلے ہاتھ سے وہ درخت کی طرف

آتا ہے۔ جھک کر درخت کے تنے سے اپنا سر نکالے، زمین پر پیڑ پھیلائے، آنکھیں میچے بیڑ  
جاتا ہے۔ اس کا چہرہ ساکت ہے۔ ●●

### توضیح

..... پردہ اٹھ چکا ہے۔

اسٹیج کے عین قلب میں میا لے رنگ کی کرسی، دھات ادھات، جھن گمان، بانیں  
ست وسط دروازہ جس پر V.I.P کی تختی لگی ہے۔ دائیں سمت، وسط دروازہ جس پر  
Lavatory کی تختی آویزاں۔ پس منظر میں سفید پردہ۔

ہال میں چند لمبے سکوت اور پھر سیٹیاں، آوازیں، چپ میگوئیاں اور شور کے بیج، ہمارا  
مرکزی کردار کاندھے پر پھاڑا ڈالے V.I.P دروازے سے نکلتا ہے۔ ہال کی جانب رخ  
کیے حسرت سے آنکھیں پھاڑتا اور منہ کھولتا ہے:

”وہ ایک گوئی اندھی بہری رات اور بستر پر آسمان گر چکا تھا..... گیلے پاؤں لیے  
حاجت گاہ سے نکلا تو سامنے رائفل بردار ہاتھوں میں مشعلیں روشن، تب بھی سالم چاند

اخبارات کے پہلے صفحے سے طلوع ہوا، کیا کیا جانے۔ غازی پور کی غلیظ گورتیں عبادت گاہوں کی طرف رواں دواں۔ پتہ نہیں چل سکا اس سال کھادی کا بیوپار بلیک کی سطح تک کیوں کر آیا۔ لوگ جوق در جوق چوک میں ایستادہ گنیش مورتی سے آگاہیں سیکھنے میں منہمک اور عشاء کی نماز کے ختم تک اوپن نمبر آچکا تھا۔ پینگ پر آخری کیل کی طرح دو ایک ہونے میں مشغول، وہ گھبرا کر شکستہ رومانی مصر سے گنگنا تا حاجت گاہ میں داخل ہوا۔ باہر علی گڑھ کی آواز پر رات گہری کر دی گئی۔ اب تو اخبارات کے صفحے حذف کر دو۔“

فی الحال..... مرکزی کردار اچانک چپ سادھے کرسی کے قریب پہنچتا ہے اور پھر میکا کلی انداز میں اپنے دائیں ہاتھ میں کرسی سنبھالے پس منظر پردہ کے قریب پہنچ کر کرسی کو پردہ سے نکالنے اسٹیج کے دائیں سمت کے انتہائی کنارے پر سانسیں درست کرتا ٹھہر جاتا ہے۔ پھر انتہائی برق رفتاری سے اپنی پشت ہال کی جانب کیے تھوڑا سا خمیدہ ہو کر زمین کھودنا شروع کر دیتا ہے۔ مرکزی کردار پسینہ میں شرابور اپنا چہرہ ہال کی جانب کیے شہادت کی انگلی سے پیشانی سے پسینہ گراتا ہے۔ اور گڑھے کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی قمیص کی جیب سے بیڑی چھماق نکال لے..... چند لمحوں بعد بے فکرے کش لیتا ہے، دو تین کش کے بعد پھر اپنی جیب سے کچھ بیج مثلاً جوار، گیہوں، چاول وغیرہ نکالے گڑھے میں ڈال دیتا ہے اور پھر بائیں ہاتھ کی جیب سے تیزی کے ساتھ گڑھا پاٹ دیتا ہے۔ کھڑے ہو کر پھاوڑا اٹھائے لمبے لمبے ڈنگ بھرتا V.I.P. دروازہ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔

”کیا ہوتی پین ہے۔“ ہال سے مکالمے تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔

اچانک V.I.P. دروازے سے ہمارا مرکزی کردار نکلتا ہے اور تیزی کے ساتھ کرسی

کے قریب جاتا ہے اس اثنا میں پس منظر پردہ کا رنگ سیاہ ہے۔ اپنی بشرت کی جیب سے وہ پلاسٹک کا تھیلی نما خول نکالتا ہے اور اسے کرسی کے ہتھوں پر چڑھا دیتا ہے اور نہایت اعتماد کے ساتھ چلتا ہوا پائی ہوئی زمین کے قریب آتا ہے، بیٹھتا ہے..... چند ہی لمحوں بعد پھر سے گڑھا نمودار ہوتا ہے۔ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے وہ اپنی چٹلون کی دونوں جیبوں سے ایک نارچ، دو سیل، سگریٹ، ماچس نکالتا ہے کش لے کر فکر مند انداز میں دونوں سیل نارچ میں ڈال کر اسے روشن کرتا ہے۔ روشن نارچ کو گڑھے کے اندر چھوڑے، زمین پائے تیزی کے ساتھ V.I.P. دروازے میں غائب ہو جاتا ہے۔

”اٹ ازمین البسروٹی“

پھر ایک بار V.I.P. دروازے سے ہمارا مرکزی کردار نکلتا ہے اور زرد پس منظری پردے کے قریب رک کر اپنے بائیں ہاتھ میں کرسی لٹکانے کرسی کو اسٹیج کے عین وسط میں رکھتا ہے۔ اپنے نہرو شرٹ کی دونوں جیبوں سے دو لمینڈ ٹائپ بوتلیں اور ایک پلاسٹک گلاس نکالتا ہے۔ بوتل میں ہرے اور لال رنگ کا مائع بھرتا ہے۔ ان دونوں مائعوں کا مرکب گلاس میں تیار کرتا ہے اور ایک بے حیا ہنسی بستا ہے۔ کرسی کے نچلے خلائے حصہ میں دونوں بوتلیں رکھے، لبالب گلاس سنبھالے وہ پائے ہوئے گڑھے کے قریب پہنچتا ہے، وہاں پر گلاس خالی کرتا ہے اور خالی گلاس اپنی بائیں جیب میں ڈال لے تقریباً بے صبر انداز میں کرسی پر بیٹھتا ہے اور آنکھیں موند لیتا ہے۔

”..... کچھ نہ ہو مگر اداکاری“..... واہ.....“

اچانک Lavatory سے ایک نوجوان اپنی ناک دبائے نکلتا ہے، بغیر ادھر ادھر نظر



کیے وہ سیدھا پائی ہوئی زمین کے قریب اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور چائیک ہی اسٹیج پر جوتے، بچل اور سینڈل کی بارش ہونے لگتی ہے۔

●● پردہ گر چکا ہے۔

## دمِ افعی

آج رام پور کے تمام ذی حیثیت لوگ پچایت گرام میں بیٹھے کسی گمبیر مسئلہ کو حل کر رہے تھے۔ پاس ہی نیم کا بیڑا اپنے ٹکے بدن کو دیکھ کر خاموش کھڑا تھا۔ پچایت گرام میں بھی لوگ سر جھکائے خاموش تھے۔ آخر سکوت کا یہ پردہ گاؤں کے سرچ فخر و چا چانے اٹھایا۔ فخر و چا چا گاؤں کی آخری نشانی تھے۔ ان کی آنکھوں نے تین حکومتوں کو اجڑتے اور بیستے دیکھا تھا اور اس پر چا چا کو بڑا فخر تھا اور ہر بات میں اپنے تجربات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا، ان کی عادت سی بن گئی تھی۔ چا چانے اپنی تجربہ کار نگاہیں لوگوں پر ڈالتے ہوئے کہا:

”آج اس بات کا فیصلہ ہونا ہی چاہئے“ تمام لوگوں نے بہ یک وقت

”ہاں“ کہا۔

چا چانے لوگوں کے اشتیاق کو دیکھا اور گویا ہوئے۔ ”معلوم نہیں وہ افعی کون

ہے۔ گاؤں آکر ایک ہفتہ ہو گیا مگر آج تک کسی نے اس کی شکل..... صرف بھیمو نے شاید اسے دیکھا ہے۔“ انھوں نے بھیمو کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”شکل کسی نے نہیں دیکھی اس بات سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ دراصل زمانہ ہی خراب آ گیا ہے ورنہ ہمارے زمانے میں کوئی نیا مہمان آتا تو وہ آٹھ روز لوگوں سے ملنے میں گزار دیتا۔ جب لارڈ مونت بیٹن ہمارے گاؤں کے قریب سے گذر رہا تھا تو میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ یہ میری اپنی بات تھی، مگر یہاں پر میں گاؤں کا سرچھ ہوں اس لیے گاؤں کی ہر بات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ ہر روز رات اس اجنبی کے مکان سے رونے کی بڑی بھیا تک آواز آتی ہے۔ جب میں نے پہلی دفعہ رونے کی آواز سنی تو مجھے محسوس ہوا آج بھی کوئی گورا ہمارے آدمی کو بازار میں گھسیٹ رہا ہو۔“ چاچا تھوڑی دیر تک اپنے حواس درست کرتا رہا۔ لوگ دم روکے سنتے رہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے سانس میں درست کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو شمو کا قصہ یاد آ گیا..... شاید اتوار کا دن..... ہاں اتواری تو تھا۔ اس روز گورے نے شمو کی بیٹی مان کو دن دھاڑے اغوا کر لیا اور شمو اسی طرح رات بھر روتا رہا..... اس بھیا تک اور دردناک آواز سے گاؤں والوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ بچے ڈر کے مارے اپنی ماؤں کے سینوں میں سر چھپا لیتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اس بھلے مانس نے اس کا نام پتہ پوچھے بغیر ہی مکان دے دیا۔“ چاچا نے فتو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لوگوں کی نظریں فتو پر مرکوز ہو گئیں۔ چاچا نے ایک عجیب سی خوشی محسوس کی اور سوچا لوگ آج بھی اس کی باتوں میں دل چسپی لیتے ہیں..... چاچا نے اپنا گلہ نکالا اور کہا ”پرسوں بھیمو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے دیکھتے ہی بھاگنا شروع کیا جو کوئی اسے راستہ میں ملتا وہ اسے دیکھ کر اس طرح بھاگتا گیا کوئی گورا پیچھے لگا ہوا ہو۔“ چاچا کو آگرمیزوں سے ازلی بغض تھا۔ فتو کی حالت غیر

ہو رہی تھی۔ اس نے چند روپوں کے لالچ میں آکر مکان کرایہ پر دے دیا تھا اور کرتا بھی کیا..... آٹھ زندگیوں اور بھوک کا بے رحم دیوتا..... اسے کیا معلوم تھا کہ کرایہ دار اتنا پراسرار ہوگا جس کی جواب دہی کے لیے اسے پہلی دفعہ پتہ چاہت گرام آنا پڑے گا۔ اس نے دیکھا سب اس کی جانب غصہ بھری کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں وہ گھبرا کر اٹھ گیا اور کہنے لگا.....

”کچھ دن ہوئے مجھے ایک خط ملا تھا..... خط میں لکھا تھا۔ ”میں آ رہا ہوں۔ زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ ایک دن کا کرایہ دو روپیہ دوں گا..... نیچے کچھ عجیب قسم کے دستخط تھے۔“ اس نے اچانک اپنے جیب سے خط نکالا اور چاچا کو دے دیا۔ لوگ اس خط کی جانب اس طرح دیکھنے لگے گویا پہلی دفعہ کسی خط کو دیکھا ہو۔ دستخط متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ کچھ مہم الفاظ تھے صرف ایک حرف ”ش“ واضح نظر آ رہا تھا۔ فتو نے دیکھا لوگوں کا غصہ کچھ تخم رہا ہے تو اس نے کہا:

”آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ گھر بھوتوں کی وجہ سے بدنام ہو گیا ہے۔ کوئی بھی اسے خریدنے اور کرایہ پر لینے تیار نہ تھا۔ میں نے بھی تنگ آ کر وہاں رہنا چھوڑ دیا، اس صورت میں کوئی آدمی ایک دن کا دو روپیہ کرایہ دے تو میری خوشی کا کیا ٹھکانہ؟ خوشی کی وجہ سے میں نے چاہی دیتے وقت اس کا نام پتہ کچھ بھی نہیں پوچھا۔ چاہی دیتے وقت چند لمحوں کے لیے میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔“ وہ تھوڑی دیر چپ رہا اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا آگے کی بات کہنے میں اسے سوزوں الفاظ نزل رہے ہوں۔ پھر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

”کچھ عجیب سا چہرہ تھا میں نے تو اسے بار بار دیکھنا چاہا مگر میری نظریں خود بہ خود جھک جاتی تھیں۔ آنکھوں میں وحشت اور یاس کی کبیریں اور چہرہ آگ کی طرح سرخ۔“

اچانک بھبھو اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

”میں نے بھی اس بھاگتے ہوئے آدمی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ بھی

آگ کی طرح سرخ تھا۔“

لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ دھرم داس جو ہمیشہ اپنے ساتھ اخبار رکھا کرتا

تھا کہنے لگا۔ ”وہ ضرور پاکستانی پیراشوٹ ہوگا۔ ہمیں اسے حکومت کے حوالے کر دینا

چاہئے۔ اس سے ہمارے گاؤں کا نام بھی ہوگا اور انعام بھی ملے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لوگوں کی

جانب اس طرح دیکھنے لگا گویا ابھی ابھی حکومت نے اسے انعام سے نوازا ہو۔ جمید نے نعیم کے

کان میں کہا ”دیکھنا وہ مہاسبائی ہوگا جو گاؤں میں فساد برپا کر کے چلا جائے گا۔“ نعیم نے اس

طرح گردن ہلائی گویا سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا ہو۔ چند رکات جو اب صرف نام کے

جاگیر دار رہ گئے تھے اور بہت دیر سے خاموش تھے کہنے لگے ”کہیں وہ چین نواز کیونست نہ

ہو۔ میرا خیال ہے وہ سو فی صدی کیونست ہے ورنہ چہرے پر لال رنگ کیوں لگوا تا؟“ یہ کہہ کر وہ

فتح مندانہ نگاہوں سے لوگوں کی جانب دیکھنے لگا اور ادھر ہیرا چند جو کیونست تھا اور دو دفعہ

الکیشن ہار چکا تھا تھلا اٹھا اور اٹھ کر انقلابی انداز میں کہنے لگا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ اس ملک میں تباہی کی ایک آندھی آنے والی ہے۔ جب تک

عوام امریکی گیہوں کھاتے رہیں گے وہ ترقی نہیں کر سکتے..... انقلاب نہیں آ سکتا“ دھرم

داس نے چند رکات کے کان میں کہا۔

”سالا کل ہی تو گیہوں کے لیے دو گھنٹے تک کھو میں کھڑا تھا۔“ اچانک چاچا کو کچھ

یاد آیا اور انھوں نے جیب سے کچھ کاغذات نکالے۔ لوگ ناک بھوں چڑھانے لگے۔ چاچا

نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا ”یہ کیا ہے؟“

لوگوں نے آکتا ہٹ سے جواب دیا، مغل بادشاہوں کی محصول ادا یگی کی رسید

ہے۔“

”اور یہ کیا ہے؟“

”یہ انگریزوں کی محصول ادا یگی کی رسید ہے۔“

”اور یہ؟“

”ہماری حکومت کی رسید۔“ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چاچا کچھ دیر مسکراتے

رہے اور سوچا باپ کی ادا کی ہوئی نقل رسید آج کا کام میں آگئی۔

”میں نے تین حکومتوں کو اجڑتے اور بھٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں پورے یقین کے

ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ضرور وہ کوئی گورا ہے جو ایک بار پھر آہستہ آہستہ ہماری حکومت کو ختم کرنے

آیا ہے۔“ دھرم داس ہنس پڑا۔ رام سنگھ نے اپنے پو پلے منہ سے بڑبڑایا ”سالا

لیگی..... اجنبی کے بارے میں چہ میگوئیاں بڑھتی جارہی تھیں، آخر کار طے پایا کہ رات

جب وہ حسب معمول روتا ہے جا کر اس سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے

اور کیا کرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پنجایت گرام خالی پڑا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرا آہستہ

آہستہ پھیل رہا تھا۔

رات جب اپنا سایہ لہسا کر چکی تھی اچانک پھر وہی رونے کی آواز ابھری۔ لوگ اجنبی

کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک رونے کی آواز بند ہو گئی۔ مجمع ٹھٹک پڑا۔ چاچا نے زنجیر

کھٹکھٹانا ہی چاہی تھی کہ آواز آئی۔ سب لوگ کھڑکی میں منڈالے دیکھنے لگے۔ وہ اجنبی اپنا منہ

چھت کی طرف کیے کہہ رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں تیرے ننانوے نام ہیں مگر آج تو ایک اور نام کا اضافہ

کر لے، ”وہو کہ باز“..... اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انسان اتنا شاطر ہوگا تو میں اسی وقت آدم کو مجھہ کر لیا ہوتا آج میں اقرار کرتا ہوں کہ مٹی آگ سے عظیم ہے۔ میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں کہ مجھے عبادت کے قابل بنا کیوں کہ لاکھوں برس ہوئے میں اسے بھول چکا ہوں یا مجھ میں بڑی کی طاقتیں انسان سے زیادہ عطا فرما۔ اب میں ایک بے کار شے ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

لوگ کمرے کے اندر کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ چا جانے منع کیا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کہا ”نہ جانے کون ہے۔ بے چارہ خدا سے کہہ رہا ہے کہ میں نے گناہ کیا اب مجھے معاف کر..... معلوم ہوتا ہے زمانہ کا ستایا ہوا ہے۔ ہمارا کیا لگا، دو تین روز رہ کر واپس چلا جائے گا..... بے چارہ.....“ لوگ سر بیچ کی بات سے مطمئن واپس لوٹنے لگے، رات اور کچھ گہری ہو گئی تھی اور فضا میں بچکیوں کی آواز عجیب اسرار پیدا کر رہی تھی۔



## آتشِ عنقا

آج تمام فرشتے جہنم کی آگ سے اپنے ہاتھوں میں دہی ہوئی سردی کو تیار ہے تھے۔ ان سب سے بے نیاز شیطان کا نکات پر ایک لامحدود کھجے کی طرح ایستادہ لوگوں کو اپنی جانب بلا رہا تھا۔ آگ کی ہستی..... بشیر، راستے ہی میں ٹھڑے کی یوتھل اپنے حلق میں اٹھیلنا جلدی جلدی آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر بھی اس رات کی سردی اس پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ وہ راستے کی بدبودار گلیوں، نالیوں سے بے پروا آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ کاش کوئی گا کہ اسے سلگا لے۔ اس کے سلگنے سے ایک چولہا سلگ سکتا ہے اور اس چولہے سے گھر کے بچوں، بیوی کے بیچھے ہوئے پیٹ کی آگ بجھ سکتی ہے، اور تو اور نندو نے سلگنے کے لیے سگریٹ کی پیکنوں سے زیادہ فلم ایکٹریوں کی تصویروں جگہ جگہ چکا دی تھیں۔ مگر اس سے ایک چوک ہو گئی تھی کہ وہ سب کی سب لباس پہنے ہوئے تھیں۔ آخر ہے نا ایک پان والا۔ بشیر نے اپنی

جیب ٹولی۔ دس کا ایک نوٹ جو کبھی کبھی تنخواہ سے پہلے آجاتا ہے اور جس کے لیے اس سردی میں جی کو مار کر وہ کام کرنا پڑتا ہے جو دفتر کی امور کے حساب سے آٹھ روز کے کام کے برابر ہوتا ہے..... اور نہ بھی کرتا تو کیا کرتا۔ سات زندگیوں کی محض بھوک مٹانا، یہ کام بھی اس کی تنخواہ نہیں کر سکتی تھی۔ یوں آٹھ افراد تھے مگر وہ اپنے آپ کو ان میں شامل نہیں کر سکتا تھا، کہ بہت سال ہوئے اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔ مسلسل فاقوں سے اس کی آنتوں نے یہ سبق لیا تھا کہ کھانا اب صرف تے کرنے کے قابل ہے۔ اس لیے وہ صرف شراب پیتا تھا صرف شراب..... کچھ دیر کے لیے تو اس سے اپنے آپ کو بھول سکتا تھا اور انہیں بھی جنہیں وہ ابھی سے فاقوں کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے دو قدم اور آگے بڑھائے اور نندو کی دوکان سے گول کنڈہ کی پیکٹ خریدی۔ ریزگاری نہیں تھی نندو نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور پیسے کل لینے کے لیے کہا۔ بیروں کا نوٹ اور نندو کی حسرت کو اپنی جیب میں ڈالے بڑھنے لگا۔

سگریٹ کا دھواں پیچھے پیچھے چکر کھا رہا تھا اور اس کے خیالات آگے کی جانب نکلنے لگے وہ سوچ رہا تھا اس کی بیوی اس کے قدموں کی چاپ کی منتظر ہوگی اور بچے بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کیا واقعی بچے اس کا انتظار نہیں کرتے؟ محض اپنی بھوک کی تسکین کا انتظار کرتے ہیں..... امیر، ملکہ تاج..... بے ارادہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہو گئی۔ اس نے بھی اپنے بچوں کے نام غیر شعوری طور پر کیسے کیسے رکھ دیے۔ کیا اس کے لاشعور میں ایک اچھی زندگی کا تصور اگڑائی نہیں لے رہا ہے؟ تبھی تو وہ ان ناموں، ان لفظوں کے سحر سے جن سے یہ نام بنے تھے، بچ نہ سکا تھا۔ اسے کتابی الفاظ یاد آگئے کہ سدھارتھ نے کہا تھا "الفاظ کے سحر سے بچو۔" کیا کوئی لفظوں کے سحر سے بچ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں خود سدھارتھ لفظوں کے سحر سے نہ بچ سکا۔ ورنہ کیا بات تھی کہ "وہ میرا بیٹا مر گیا" کے سحر سے بچ نہ سکا اور

نروان کی تلاش میں انسانی دکھ کے مداوا کے لیے نکل پڑا۔ ورنہ لاکھوں لوگ روز بے جملہ سنتے ہیں اور کانی ہاؤس کی طرف چل دیتے ہیں۔ سدھارتھ کی طرح نروان کی تلاش میں نکل نہیں پڑتے۔ دراصل لفظ بڑا ساحر ہے جو شخصیت دیکھ کر عمل کرتا ہے۔ لفظ محبت میں وہ سحر ہے معلوم ہوتا ہے کوئی مدہم مدہم سروں میں مسلسل گھنٹیاں بجا رہا ہو۔ لفظ نفرت میں چنگھاڑنے والی موسیقی نکلتی ہے لفظ بھوک سے کسی خون خوار بھیڑے کا تصور ذہن کے پردے پر چھا جاتا ہے۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کبھی نہ کبھی الفاظ کے نروان کو پالیتا ہے۔ اگر چاہ محبت میں مدہم سروں کی گھنٹیوں کے بجائے لاتعداد چھینٹیں نکلتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ زمانے نے ہر چیز کا چہرہ مسخ کر دیا ہے، اسی طرح جس طرح امیر، تاج، ملکہ..... اپنے باپ کے بجائے اپنی تسکین کے انتظار میں ہیں..... بشیر کے ہونٹوں سے ہنسی معدوم ہوتی گئی اور اس نے غصے سے سگریٹ ایک طرف پھینک دیا۔ سامنے نذرا اللہ اپنی تجوری سے ٹیک لگائے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا گویا وہ اس سردرات میں تجوری کو آتش دان سمجھ رہا ہو۔ بشیر اس سے نظریں پچاتا تیزی سے نکل گیا کیوں کہ گذشتہ مہینے کا حساب باقی تھا۔ گھر قریب آ رہا تھا۔ اس نے سامنے کی دوکان سے دو درجن کیلے خریدے اور پیسے جیب میں ڈالے گھر کی طرف چل دیا۔

دروازے پر قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا وہ گر پڑے گا وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ بچے فوراً کیلوں پر چھپٹ پڑے اور وہ دھم سے بستر پر گر پڑا۔ بیوی سے رضائی منگوائی اور اسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ مگر سردی تھی کہ کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بیوی نے کنکھیوں سے کیلوں کی طرف دیکھا۔ سارے کیلے ختم ہو چکے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور بچوں کو بستر پر سلا دیا اور بے بسی سے چھلکے اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ ایسا لگ

بشیر نے جواب دیا۔

”میں کوڑے لگاؤں۔“ پہلے بزرگ نے کہا۔ سزا ختم ہونے پر اس نے سوال کیا ”تم نے رشوت لی؟“

”ہاں۔ جب کبھی.....“

”..... میں کوڑے،“ فرشتے نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس طرح مختلف سوالات ہوتے رہے اور وہ کوڑے کھاتا رہا۔ آخر میں ایک بزرگ نے کہا۔

”کیا تمہیں آخرت پر یقین تھا؟“

بشیر کے ہونٹوں پر زبردست دوز گیا۔

”قرآن پڑھا تھا؟“

بشیر نے جواب دیا ”ان اللذیع الصابرين“

”میں کوڑے“

سزا ختم ہونے پر دونوں بزرگ واپس جانے لگے۔ بشیر نے آواز دی اور پوچھا ”کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں؟“

”ضرور“ دونوں نے جواب دیا۔

بشیر نے حسرت بھرے لہجہ میں پوچھا، ”قبر کا عذاب ختم ہو گیا؟“

”ہاں۔“ جواب ملا۔

اچانک بشیر کے منہ سے ایک تہمت نکل پڑا اور اس نے کہا۔ ”تو وہ مولوی جھوٹ کہتا تھا کہ قبر کا عذاب انسان کی برداشت کے باہر ہے۔ اتنا عذاب تو میں نے زندگی میں چند لمحوں

رہا تھا وہ پھلکے نہیں اپنی بھوک بھینک رہی ہو، پھر وہ آہستہ سے چلتی ہوئی بشیر کے بستر تک آئی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور وہ بھی لاچار سونے کی کوشش کرنے لگی۔

سورج نے آہستہ آہستہ اپنی پلکیں کھولیں مگر بشیر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں..... اس کی بیوی نے باپ کو تکلتے ہوئے بچوں کے چروں کو دیکھا وہ یہ نہیں کہہ سکی اب وہ بشیر کا، اپنے باپ کا انتظار نہ کریں۔ وہ پھر تک کسی طرح رویوں کا انتظام ہو گیا اور لوگ اس کو دفن کر گھروں کو واپس آ گئے۔

بشیر نے آنکھیں کھولیں چاروں طرف گپ سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ آج وہ واقعی مر گیا ہے۔ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ نہ جانے کیسے نہ میرے بعد کس طرح گھر چلا..... چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ دو نورانی صورت بزرگ قبر میں داخل ہوئے اور بشیر کی جانب بڑھنے لگے، ان میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بشیر نے ٹوکا ”مجھے عربی نہیں آتی۔“

دوسرے بزرگ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا ”یہاں زبان کا جھگڑا نہیں ہے۔“

پھر پہلے بزرگ نے کہا ”تمہارا نام؟“

مردے کے چہرے پر سنجیدگی آئی اور اس نے جواب دیا ”کھرک“

بزرگ نے آنکھیں نکال کر کہا ”تم تمہارا پیشہ نہیں بلکہ نام پوچھ رہے ہیں۔“

”ہمارا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ ویسے مجھے بشیر کہتے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تم نے اپنی زندگی میں شراب پی ہے؟“ ایک نے پوچھا۔

”ہاں جب کبھی نم حد سے تجاوز کر جاتے تو یہ مجھے سہارا دیتی تھی۔“

## حیات

اسی مکان میں، جس کی ایک دیوار، بھرپور برسات کی پھیوار میں خود کو منہدم کرنے کے انتظار میں کھڑی ہے، وہ اپنی تخلیقات کو سوچ نکالتا ہے۔

مکان کا ذرہ، گھٹنا گھٹنا سا ماحول، شاداب مگر بوڑھا نیم کا درخت اور وہ شکستہ کرسی جو انتظار کرتی ہے کہ کب وہ اپنی تخلیق کو مکمل کیے اس کی آغوش میں سمائے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے، سب ہی چند ماہ سے اس کی جانب پر امید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

کبھی کبھی اسے یہ خیال ہوتا کہ جب کبھی وہ اپنی تخلیق مکمل کیے دل ہی دل میں، لبوں کے اوپری حصہ میں مسکراہٹ دبائے ہوتا ہے، یہ کرسی بھی اس کے ساتھ مسکراتی ہے۔ شاید اس کی چہرہ اس بات کی گواہی دیتی ہے..... یہ کھڑکی جس کی زنگ آلود سلاخوں پر وہ اپنا سر نکالنے اور دائیں جانب کی سڑک پر چلتے پھرتے کرداروں کا مشاہدہ کر رہا ہے اور کہیں سے

کے سہا ہے۔ ”فرشتے آگے بڑھنے لگے۔ بشیر نے پھر ٹوکا اور لیا جت سے کہا ”آخری سوال کیا واقعی انسان فرشتوں سے ”ظہیم تر ہے؟“

”ہاں“ کہہ کر وہ دونوں چل دیے اور قبر میں گھپ سیاہی پھیل گئی۔ ●●

اس نے بہت سے کرداروں کو اپنی تخلیقات میں سمویا ہے، اس سے شکوہ کر رہی ہے کہ آخر کب تک، وہ، یونہی اس کے جسم پر اپنا جسم لگانے کرداروں کا انتظار کرتا رہے گا۔

آج وہ کئی ماہ سے اپنی کسی تخلیق کے لیے سرگرداں ہے۔ روزوہ کرسی، کمرے کا ماحول بوڑھا پر اسرار درخت اور یہ کھڑکی، عجب نظروں سے اسے تاکتے رہتے ہیں کہ شاید وہ قلم اٹھائے مگر اس کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ کوئی تخلیق الہامی یا آکسانی ہی تھی، ذہن کے پردوں کو نہیں ہنچھوڑی تھی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ شاید جان بوجھ کر، اپنی تخلیق، جو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں دبئی کر رہی ہے، جگا رہی ہے، مگر فوراً ہی اس خیال کو تشکی و حقیقی رخ سمجھ کر جھٹک دیتا۔

وہ سوچتا! انسان بھی کتنا ستم ظریف ہے الزام رکھنے کی عادت، خواہ وہ اپنی ذات پر کیوں نہ ہو، کسی بری طرح کا شکار ہے۔ اسے کسی پل چین نہیں رہتا، کسی نہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر، وہ اپنے اندر طمانیت اور سکون، چند لمحوں کے لیے ہی کبھی، پیدا کر لیتا ہے۔

وہ تو اور اداں ہو گیا، لوگوں کی یہ بات ذہن میں آئی کہ ابدی فن کی تخلیق کے لیے کسی پریرنا کا ہونا ضروری ہے۔ یہ پریرنا ہی کا غم ہوتا ہے جو اسے تخلیق پر اکساتا ہے۔

وہ سوچتا: پریرنا کا غم ہی کیوں؟ پریرنا کی خوشی کیوں نہیں؟

لیکن اسے اس سے کیا؟ وہ تو اس نیم کے درخت کی طرح..... تنہا تھا۔ وہ ابھی کچھ ماہ پہلے اتنا تنہا نہ تھا..... یوں نیم کے درخت پر خزاں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا مگر مکان کے عقب سے ابھرتے، بہار کے قہقہے اسے موسم سے بے نیاز کر دیتے۔ پھر قہقہوں کے الوداع پر کیا رہ گیا تھا؟ غم.....

مگر اسے تو کسی پریرنا کا غم نہیں تھا؟ اس کا غم تو یہ تھا کہ اس کی تخلیق کہیں کھو گئی ہے اور

جسے کھو جتا اس کا مقدر ہے۔ نہ جانے، نہ معلوم غم کیسے ہوتے ہوں گے۔

آج بھی جب وہ مرکز پر لوگوں کی جانب غائر نظر ڈال رہا ہے تو اسے ایسے ہی افراد نظر آ رہے ہیں جن کو اس نے اپنی کسی نہ کسی تخلیق میں جگہ دی تھی، وہ ہاتھ میں تھیلی پکڑے جاتا ہوا مزدور نہیں، تھکے تھکے قدموں سے آتا ہوا عثمان کلرک، لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پروفیسر نرنجن، سب ہی اس کی تخلیقات کے کردار رہ چکے ہیں۔ اب ان کی مصروفیات میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی..... اور تو اور وہ فٹ پاتھ پر دونوں ہاتھوں سے بے نیاز کوشی بھی اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا جسے اس نے آج سے پانچ سال قبل اسی طرح گھینٹا ہوا دیکھا تھا اور آج بھی وہ گھیسٹ گھیسٹ کر رہی رہا ہے۔

وہ سوچتا ہے، انسان میں جینے کی تمنا کتنی فرہ ہے بھر پور زندگی کے ساتھ زندہ ہے۔ زندگی خواہ گھیسٹ گھیسٹ کر ہی گذرے مگر وہ موت کے آرام دہ بستر پر سونا نہیں چاہتا۔ جینے کی ہوس نے ہی شاید روح کی عظمت کا فلسفہ ایجاد کیا ہوگا..... وہ موت کے وقت بھی یہ یقین کر کے خوش رہتا ہے کہ کم از کم اس کی روح تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گی۔ حالانکہ اس کے دل کی اندرونی تہوں میں یہ حسرت دبئی ہے کہ روح سے ہمیشہ کے لیے رشتہ جوڑ لینا، جسم کی ساری لطافتوں کو خواہ وہ کتنے ہی آلام سے بھری کیوں نہ ہو، کھود بیٹا ہے۔ اس لیے آج بھی وہ جسم کو پہچانا چاہتا ہے۔ زندگی کی آخری سانسوں تک۔ تو بے! اس نے سوچا، کیا روایتی، پٹے پٹائے خیالات نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ مگر ایک کہن آلود زندگی سے اور تو قہقہے بھی کیا کی جاسکتی ہے؟

وقت جیتا جا رہا ہے، اس کی الجھن اور کوفت بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگوں کی گردن میں زندگی کا بل ڈالے وقت بڑی بے دردی سے انھیں ایک ان جانی منزل کی جانب کھینچ رہا ہے اور وہ یہاں بے کار ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے، وہ بے کاری تو ہے۔ اونہد، تو بہ!



اچانک فضا میں ایک تبدیلی آرہی ہے۔ لوگ سراسیمگی سے تیز قدم اٹھائے رواں دواں ہیں۔ شام کی شاہ زادی نے دوپہر کے شاہ زادے سے کچھ کہا ہے۔ شاہ زادے کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا ہو گئے ہیں اور وہ شاہ زادی کے محل سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ نہ جانے کہاں جا رہا ہے۔ پھر الوداع ہوتے ہوئے شاہ زادے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کے چند قطرے ٹپکے اور آسمان سے بوند باندی شروع ہو گئی۔ شاہ زادی نے یہ دیکھا تو اپنی باندیوں کو حکم دیا کہ سازوں پر طربیہ نغمہ چھیڑ دیں، باندیوں نے ہزاروں سازوں پر طربیہ نغمہ چھیڑ دیا ہے۔ جو اس کی ٹین کی چھت پر آ کر اور بھی طربناک ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر گرتے ہوئے شاہ زادے نے ایک آہ بھری جو ان نعموں میں بے ترتیبی پیدا کر رہی ہے۔ شاہ زادی نے گہرا کراہنا سرخ محل بند کر دیا ہے اور چاروں طرف ایک دھند لکا چھا رہا ہے۔ سڑک کسی نا اُمید سکتہ گرجا شوق کے دل کی طرح خالی ہو گئی ہے۔

اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور دیا سلائی جلائی۔ مگر وہ بے ترتیب ہواؤں کے آگے سنبھل نہ سکی، پھر اس نے دوبارہ بڑی احتیاط سے اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان جلتی دیا سلائی سے سگریٹ جلا یا اور لمبے کش لینے لگا۔ وہ سوچتا ہے: ”ہر چیز کو نہ جانے سہارے کی ضرورت کیوں ہے۔“

پھر اس کی نگاہ اپنے سامنے کی لمبے نما عمارت پر رکی اس نے سوچا: ”کبھی یہ عمارت کتنی تمکنت سے کھڑی رہی ہوگی، مگر اب اس میں جا بے جا دراڑیں، گرمی ہوئی دیواروں کے ڈھیر کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں نظر آتا۔ اس کی نظریں اس ویران عمارت کا احاطہ کرتے ہوئے اوپر کی جانب اٹھ گئیں اور اسے پہلی بار چونکنا ہی پڑا۔ عمارت کے بالکل اوپری حصہ پر ایک شکستہ تختی گڑھی تھی جس پر کسی نے بڑی خوب صورتی سے تراشا تھا۔ ”حیات.....“ آدھی تختی ٹوٹ

چکی تھی اور اس کا دوسرا حصہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ پلاسٹر سے بے نیاز دیوار منہ پڑا رہی تھی۔ شاید اس گم شدہ تختی کے ٹکڑے پر اس عمارت کی پیدائش لکھی ہو جو اب گم ہے، مگر یہ نام بھی کتنا عجیب تھا۔ حیات، ہائے حیات! اس نے زور کا کش لیا اور پھر اس کے منہ سے نکلا، ”اُف حیات، سگریٹ کی راکھ باہر پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔ ”اوپر حیات! اس کی ذہنی رو بہک گئی اور اس نے سوچا:

”نہ جانے حیات کے آگے کیا ہوگا؟ حیات کے آگے کیا ہو سکتا ہے، اس کے ذہن نے سوال کیا..... شاید حیات منزل ہوگا؟ حیات کی بھی کوئی منزل ہے؟“

کیا حیات بجائے خود ایک منزل نہیں!

تو پھر شاید ”حیات محل“ ہوگا، اس نے سوچا، نہ جانے حیات محل کیسا ہوگا؟ مگر اب تو یہ محل ڈھیر ہو چکا تھا۔ کاش اس نے سوچا! اسے وہ تختی کا گم شدہ ٹکڑا مل سکتا اس حیات محل..... کونہ جانے کس نے بنایا تھا؟ شاید کسی بے فکرے نواب نے بنایا ہوگا۔ پھر وہ جلدی جلدی کش لینے لگا اور اس کی نگاہیں فوراً اپنے قلم پر اٹھ گئیں مگر دوسرے ہی لمحہ وہ تذبذب میں پڑ گیا کیوں کہ یہ بڑا وسیع معاملہ تھا۔

”تم کہاں گم ہو گئی ہو بہا عقرب!“ اس نے سوچا، نیم کے پتے سرسرا اٹھے۔ کڑوی سرشت والا بوڑھا درخت! انسان کی مجبوریاں! مگر اس بے فکرے نواب کی جانے کیا مجبوری تھی جو اس نے اس عمارت کا نام حیات..... رکھا!

شاید حیات اس کے بچے کا نام ہو۔ بچہ اور حیات..... کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اور اسے یہ بھی عجیب لگا، جب اس نے اس عمارت کے اگلو تے محفوظ کمرے کے بہت بڑے دروازے پر ایک چھوٹا سا سطح قفل چھوٹا دیکھا!!

اب فضا میں ایک ہلکا سا خوش گووار احساس پیدا ہو رہا تھا۔ وہ ایک سگریٹ سلگا چکا تھا۔ اور پھر اس کی نگاہیں حیات کے پھانک پر مرکوز ہو کر رہ گئیں..... سگریٹ کے مرغولوں کے اس پار دھندلے دھندلے ماحول میں اس نے پھانک پر یہاں کے ایک مشہور سماجیات کے پروفیسر کو کھڑا دیکھا، پروفیسر چھڑی کا سہارا لے کر اپنی عینک کے پیچھے گول گول آنکھوں سے حیات کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خمیدہ کمر کو اٹھائے آہستہ آہستہ حیات کے اندر بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے پھانک کے اندر قدم رکھا، آسمان نے اپنے سینے کے اندر دیر سے دبی ہوئی چیخ اگل دی۔ اسے ایسے لگا جیسے حیات تھر تھرا رہی ہو۔

پروفیسر آگے بڑھتا ہوا قفل کے پاس رک گیا، اور اس کے تھڑی دار چہرے پر شکنیں واضح ہو گئیں۔ وہ قفل کو غور سے دیکھتا رہا اور بعد میں اپنی چھڑی کو زور سے زمین پر دباتے ہوئے قفل کی طرف منہ کیے کہنے لگا۔

”یہ تو صحیح ہے کہ خون بہہ رہا خون ہے اور تمام انسانوں کے خون کا رنگ ایک ہی ہے، مگر اس خون میں تیرنے والے خلیوں کے رنگ تو بہر حال جدا ہیں۔ اس لیے رنگ ہی اصل چیز ہے۔ رنگوں میں برتری ہے، رنگوں میں کمتری“، اسی کے ساتھ قفل ایک جھٹکے کے ساتھ خود بہ خود کھل گیا اور پروفیسر نے فاتحانہ انداز میں دروازہ کھولا اور کمرہ میں داخل ہوا۔

وہ پروفیسر کی ایک حرکت کو کھڑکی سے دیکھ رہا تھا اور اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ عجیب ماجرا تھا۔ اس ملک کا مشہور پروفیسر جس کی کئی کتابیں سماجیات کے موضوع پر چھپ چکی تھیں، اس دوران حیات میں کیا کرنے آیا تھا؟ اور..... اچانک ہی پروفیسر کمرے سے نکلا اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ اس نے دروازے کی زنجیر لگائی اور اپنی جیب سے ایک اور قفل جو جھپٹے قفل سے بڑا تھا لگا دیا۔ یہ قفل اس قفل کی طرح مسطح نہیں

تھا بلکہ اس پر ایک چمکتی ہوئی کیل صاف نظر آ رہی تھی..... وہ فاتحانہ چال چلتا ہوا حیات سے باہر نکلا اس نے پھر ایک بار حیات کی طرف غور سے دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کہیں چل دیا۔ اس کے دل میں اچانک ایک خواہش ابھری کہ وہ پروفیسر سے اس ماجرے کو پوچھے مگر اس کو اس کی رہائش کا پتہ معلوم نہ تھا، پھر اُس نے سوچا: خود ہی جا کر اس کمرے کو دیکھ آئے۔ مگر وہاں تو پروفیسر کا قفل لٹک رہا تھا اور وہ قفل بھی کس طرح جھٹکے کے ساتھ خود بہ خود کھل گیا تھا؟ اس نے اپنی آنکھیں زور سے ملیں کہ شاید اس کے تخیل نے یہ سارا بکھیرا کھڑا کر دیا ہو مگر وہاں سچ سچ پروفیسر کا لگا ہوا قفل لٹک رہا تھا۔ سیاسی غالب ہو رہی تھی اور اس کمرہ کا راز، پروفیسر کی عجیب حرکت، اسے بے کھل کر رہی تھی۔ وہ رات بڑی بے چینی سے گزری۔ رات خواب میں وہ قفل اسے لٹکا ہوا دکھائی دیتا رہا۔

صبح رات سے زیادہ پریشانی لائی۔ وہ اسی طرح کھڑکی سے سر نکالنے سوچ رہا تھا کہ یہاں کا ایک مشہور عالم جس کی مذہبی علییت کی دھوم تھی، چھڑی لٹکائے اپنی بھوری بھوری آنکھوں سے حیات کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھانک کی طرف بڑھتے ہوئے قفل کے پاس رک گیا اور عالمانہ انداز میں قفل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اور اس زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے، وہ انسانوں کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس میں بڑی بڑی حکمت والی باتیں رکھی گئی ہیں اور دانش مندوں کے لیے یہ تختہ ہیں۔ تم اس کے راز ڈھونڈ نکالو اور وہ راز جب تم پر منکشف ہو جائیں تو فساد برپا نہ کرو۔“ بات ختم ہوتے ہی قفل جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور عالم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے قفل کو ایک طرف پھینکا اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا، تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا، جاتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک قفل نکالا اور اسے زنجیر سے لٹکاتے ہوئے باہر قفل کیا۔ قفل

پردہ چمکتے ہوئے کیل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ قتل بھی سابقہ قتل سے کچھ بڑا تھا۔ عالم نے بھی باہر آ کر حیات کی طرف غور سے دیکھا اور کہیں چل دیا۔ اس نے چاہا کہ اس سے کچھ پوچھے مگر اس خیال کو فوراً جھٹک دیا کہ ممکن ہو، کوئی اور بھی آ جائے۔

اور ایسا ہی ہوا..... دوسری صبح یہاں کا ایک اہم سیاست داں نظر آیا جس نے ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس نے قتل کو ہاتھ میں لیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر تک اس کے ادیبز عمر چہرے پر سوچ کی شکنیں ابھریں اور پھر اس نے شانے سکوز کر کہا ”سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔“ اور قتل جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ سیاست داں اندر داخل ہوا اور کچھ دیر بعد اس نے پچھلے قتل کو پھینک دیا اور اپنی جیب سے اس سے بڑا اور تین کیل سے آراستہ قتل لگا کر چل دیا۔

اب کے وہ چونک گیا کہ آنے والی شخصیت مشہور سائنس داں کی تھی جو ایٹمی اسلحہ کا سخت مخالف تھا۔ وہ نیٹس سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے جوان چہرے پر ایک عجب اسرار تھا۔ اس نے اپنا منہ قتل کے قریب لاتے ہوئے رازداری کے سے لہجہ میں کہا ”کیا ہماری مسکراہٹ میں ہیر و شیمہ کا سارا درد مسکرا رہا ہے؟ اے غنی، ہم کے مہدائے پنہاں؟“ اور اچانک ہی قتل نے جھرجھری لی اور جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ سائنس داں اندر داخل ہوا اور کچھ دیر بعد قتل کو پھینک کر اپنا چار کیل والا قتل زنجیر میں پھنساتے ہوئے تیزی سے غائب ہو گیا۔

آج کی صبح بڑی بوجھل تھی، ہوا میں نیم کی کڑواہٹ پھیل چکی تھی، ایک بوجھل پن ٹپک ٹپک کر ذہن کو اور بوجھل کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان لڑکھڑاتا ہوا حیات کے قریب رک گیا۔ یہ نوجوان مجنون تھا۔ کچھ دن پہلے تک اس کا شمار یہاں کے ذہن لوگوں میں ہوتا تھا مگر جب سے اس پر جنون طاری ہوا تھا وہ لوگوں کو روک روک کر راز دارانہ انداز میں

اوٹ پٹا نگ باتیں کیا کرتا۔ اس نے پھانک کولات ماری اور قہقہہ لگاتا اندر داخل ہوا وہ قتل کے پاس روٹی صورت بنائے ٹھہرا رہا اور بعد میں قتل کو ہاتھ میں لیے کیلوں کو گننا شروع کیا۔ ایک..... دو..... تین..... چار..... اور پھر اس نے قتل کے پاس منہ لگائے اور دھرد بیکھا اور کہنے لگا ”میں کون ہوں؟“، اچانک قتل کھل گیا اور وہ کمرے میں داخل ہوا، کچھ دیر بعد وہ جذبات سے عاری چہرہ لیے کمرہ سے نکلا اور پانچ کیلوں والا قتل دروازے پر لٹکائے لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔

چار دن بیت گئے مگر اس مجنون کے بعد کوئی اور نہ آیا اس کے صبر کا پیمانہ نہ لہریز ہو گیا اور کمرے کا راز معلوم کرنے کے لیے، وہ اپنے مکان سے نکلا۔

اس کی نظریں بھی خود بخود حیات کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں..... پھانک کو پار کر کے..... وہ قتل کو کھولنے کی کوشش میں جھٹکے دیتا رہا۔ مگر قتل کھل نہ سکا، پھر اچانک اسے پروفیسر، عالم سیاست داں، سائنس داں اور مجنون کی حرکتیں یاد آ گئیں اور وہ قتل کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بہار عقب، بہار عقب“..... تم کوئی پریرتا نہیں ہو؟“ اور قتل جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور وہ دل کی دھڑکنیں سنبھالتا حیات کے کمرے میں داخل ہوا۔ حیات میں داخل ہوتے ہی اس نے دیوانہ وار اس کے ہر حصہ کی تلاشی یعنی شروع کی مگر وہ یہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا کہ وہاں کئی دیواروں، خالی محرابوں، خالی کھونٹیوں، کھلی چھت اور سونے فرش کے سوا کچھ نہیں تھا..... ●●

## مد عاتہہ سنگ

ایک رات: وہ سب اتفاق سے ایک ایسی وادی میں ملے، جو دنیاوی پہنچاؤوں سے ذرا دور سانس لیتی تھی۔ سب کے دلوں میں، ان ہی سوالات کا طوفان تھا جس کی دھمک وہ ساہا سال سے محسوس کر رہے تھے۔

وہ رات ایک ایسے رشی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو اپنی تھوڑی مالا کو ستاروں کی شکل میں بکھرائے اپنی تپسیا کو سج کر، دم بھر کے لیے لیٹ گیا ہو۔

وہ سب چاہتے تھے کہ جلد از جلد اپنی کنگ ایک دوسرے سے کہہ دیں۔ مگر وہی جھجک ان کے دلوں کو گرفت میں لے چکی تھی، جس کی وجہ سے آج تک وہ اپنی کنگ کسی سے ایک دوسرے سے کھل کر نہ کہہ سکے تھے۔

مگر آج تو ایک ایسا اتفاق تھا جس کے تاثر سے زمین کا سینہ ایک مکمل سکون کے

جذبہ سے سرشار اور آسمان دیدہ حیرت سے، ان سب کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ منظر اس سے زیادہ طرب ناک ہے جب اس کی تخلیق ہوئی تھی۔

آج وہ سب، اپنی اپنی راہوں سے ہٹ کر ایک مشترک پگڈنڈی پر نکل پڑے تھے۔ بہت دیر کے سکوت کے بعد ایک نوجوان بھکشو بڑے جوشیے انداز میں اٹھا، اور مشینی

انداز میں، ان سب سے کہنے لگا:

”انسانی دکھ کی کتنی صرف آتما ہی کے سہارے حاصل نہیں ہو سکتی، یہ تو صرف ایک کارن ہے اور یہ شریری اس کارن کا کاربہ ہے، چاہے ہم لاکھ اپنی آتما کو بھگوان کے آدرشوں پر چل کر اسے نروان کی سہاؤں تک لے جائیں پر نوجو شریرو کو بچانا ضروری ہے اور ایک سنگندھ آتما، ایک شریری میں ہی جیوت رہ سکتی ہے، اور شریری، ہم بھکشوؤں کا شریرا انسان کے دان ہی کی وجہ سے بچا ہوا ہے اور آج کا انسان، جو ہمارے شریرو کو جیوت رکھتا ہے، کتنا دیکھی ہے، کتنا سٹ پٹایا ہوا ہے۔ اسے ایک ایسے نروان کی تلاش ہے جو اس کے دکھوں کا انت کر سکے۔“

ہم سب آج بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ انسان کے دکھوں کا انت کر دے۔ بھکشو اپنے تہمتاتے چہرے سے پسینہ پونچھے اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ جیسے ہی اس نے اپنی آنکھوں سے ہاتھوں کو ہٹایا، ایک بیوی دور کونے سے اٹھا اور بلند آواز میں پوچھنے لگا۔ اس کی آواز پوری وادی میں گونج گئی۔

”پر بھگوان بدھ نے تو کہا تھا کہ دکھوں کا کوئی انت نہیں ہے۔“

وہ سب چونک اٹھے۔ لیکن جب آواز کا ظلم ٹوٹا بھکشو نے جواب دیا۔

”دکھوں کا انت نروان ہے جو بدھ کو حاصل ہوا۔“

اسی پر چھائیں نے پھر بلند آواز میں کہا ”نروان تو گیان ہے اور گیان دکھ ہے۔“

”پرگیان آدمی کے پاس کہاں؟“ بھکشو نے تسخرانہ انداز میں کہا۔

”گیان ہی تو کسی پرانی کو آدمی بناتا ہے۔“ پرچھائیں کے لہجے میں مضاس تھی۔

نوجوان بھکشو نے بگڑتے ہوئے آواز لگائی۔ ”تو تم دکھوں کا کوئی انت نہیں مانتے۔“

”انت کیا ہے۔“ پرچھائیں کا سوال وادی میں گونج گیا پھر وہی سکوت ماحول پر

طاری ہو گیا۔

رات اپنا چولا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک ایسے آدمی کا چہرہ نظر آ رہی تھی جس کے

ہاتھ پر پسینہ کی بوندیں تاروں کی طرح ٹٹمٹما رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ایک عیسائی راہب سینے پر کراس بنا تے ہوئے اٹھا اور کہنے لگا ”انت

فتا ہے، جب مٹی مٹی میں مل جائے گی اور کوئی نہ بچے گا۔“

راہب کی بات ختم ہوتے ہی ایک مجذوب نے جواب دیا ”مگر ہر چیز فانی ہے

قیامت برحق ہے۔“ پرچھائیں تھوڑی دیر مسکراتی رہی اور پھر اس نے مجذوب سے پوچھا

”قیامت کیا ہے؟“

مجذوب نے اپنی شہادت کی انگلی متصوفانہ انداز میں گھماتے ہوئے کہا:

”قیامت۔ بجز اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ خدا کو اپنے مضحل اعضا کو پھر سے توانا بنا

نے کا خیال ہو۔“

پرچھائیں نے تلخ لہجے میں جواب دیا ”مگر خدا تو کہتا ہے کہ اس نے محسوس کیا وہ

ہے، وہ تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ فانی نہیں ہے، وہ کبھی نہیں تھکتا اور نہ اسے اوجھ آتی ہے اور نہ ہی

وہ جاگتا ہے۔ وہ کہتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ ہر عمل کا وجود، اس کو، اس عمل کے خاتمہ تک کی خبر

دے جاتا ہے۔

یہ ایک راہب کو کوئی بات سوچھی وہ کہنے لگا ”اسی خدا کے بیٹے نے ہمارے دکھوں کا

سارا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے۔ نجات کا فیصلہ صلیب پر پھیلی ہوئی خون کی تحریر سے ہو چکا ہے۔“

”جب سارا بوجھ اٹھ چکا ہے تو پھر دکھوں کا مسئلہ کیوں اٹھایا جا رہا ہے اور یہ بے چینی

کیوں“ پرچھائیں نے استفسار کیا۔

ایک بار پھر ماحول اسی طرح ساکت ہو گیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا

ہو اور وہ اس طمانچہ کے معنی ڈھونڈنے میں سکتے زلزلہ ہو گیا ہو۔

رات نے ایک بار پھر اپنا لباس اتار پھینکا تھا، اب وہ ایک ایسی گناہ گار عورت کی

طرح دکھائی دے رہی تھی جو اپنے گناہوں کو چھپانے کی ساری تدبیریں ہمارے مسلسل آنسو

بہائے جارہی ہو اور یہ آنسو سارے آسمان پر ٹٹمٹاتے ہوئے تاروں کی شکل میں، اس کی مکاری

کاراز، سرگوشیوں کے انداز میں ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں۔

وادئ میں ان چاروں کی سرگوشیاں ابھرتی رہیں اور بالآخر ان میں سے ایک نے

اس کی جانب مڑتے ہوئے کہا:

”تم کون ہو؟“

پرچھائیں نے پُر اعتماد لہجہ میں جواب دیا۔ ”میں خالق کی وہ تخلیق ہوں جو کبھی مٹی کا

نرم گودا اور کہیں ناقابلِ تسخیر چٹان، مجھ میں آگ ہے اور پانی وہ ہوا بھی، میں زہر یلا انجی ہوں

اور تریاق بھی، میں تھکتا ہوں، مگر حیات میرے ہی ہاتھوں جدوجہد کا سبق سکھاتی ہے۔ میں سوتا

ہوں مگر کائنات کے جاننے کا علم حاصل کرتا ہوں۔ میں.....“

”بس بس اپنی بکواس بند کرو۔ ہم سمجھ گئے کہ تو کون ہے۔“ وہ پرچھائیں ان چاروں

کی جھنجھلاہٹ پر خاموش ہو گئی۔

بھکشو نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ وہی ہے جو منٹس کو دکھ کی راہ دکھاتا ہے۔“

بھزوب نے اس کی طرف انگلی گھماتے ہوئے کہا ”یہ وہی ہے جس نے کہا تھا کہ میں آگ سے بنا ہوں۔“

تپسوی نے مالا کا چاہ ختم کرتے ہوئے کہا ”یہ وہی ہے جس نے سوچا تھا کہ ہم سو ہیں اور وہ پانچ۔“

راہب نے کراس بناتے ہوئے کہا ”یہ وہی ہے جس نے صلیب پر کیلیں ٹھکرائیں۔“ سکھوں نے اس کی جانب غصہ بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ پرچھائیں، ان سے دور، ایک بول کے سائے میں بیٹھ گئی۔ وہ سب انسان کے دکھوں پر اختلاف کرتے رہے اور آخر میں انسان کے مشنر کے دکھوں پر غور کرنے لگے، بہت دیر چھ میگیونیوں کے بعد اس نے سنا کہ انسان کے مشنر کے دکھ صرف تین ہیں۔

بھوک! غم!!! اور موت!!!

یہ طے کرنے کے بعد وہ سب، اپنی اپنی عبادتوں میں کھو گئے۔ ماحول پر ابھی کافی اندھیرا طاری تھا کہ اچانک ایک تیز قسم کے نور کی آمد سے وہ سب چونک اٹھے اور دور کہیں سے خواب ناک آواز ابھری:

”مانگو۔ میں تمہاری عبادتوں سے واقف ہوں۔“

ان سب کے چہرے ہشاش بشاش اور ایک فتح مندی کا تناؤ ان کی گردنوں سے عیاں ہونے لگا، وہ سب روشنی کی جانب رخ کیے کہنے لگے۔

”اے! دور چھپی لاسحد و طاقت! انسان پر سے بھوک کا وجود اٹھالے۔ ان کے اندر

سے غم کا تصور ختم کر دے اور موت کا وجود فنا کر دے۔“

تھوڑی دیر کے لیے نور جھللا سا گیا اور آواز آئی ”مجھے تمہاری مانگیں منظور ہیں مگر

تمہیں بھی میری ایک شرط ہر مانگ کے ساتھ ماننی ہوگی۔“

”ہمیں منظور ہے“ سکھوں نے یہ ایک وقت کہا۔

”مگر کیا میری شرائط کو تمام انسان قبول کر لیں گے؟“

”ہم اسے راضی کر لیں گے، وہ اپنے دکھوں کے خاتمہ سے لیے تیری ہر شرط منظور

کر لے گا۔“ انہوں نے مکمل طمانیت کے ساتھ جواب دیا۔

تو پھر میں انسان پر سے بھوک کو اٹھا لوں گا، مگر اس کے بدلے میں اس کے ہاتھ پیر

نکال لوں گا، غم کا تصور بھی انسان کے پاس نہیں رہے گا مگر اس کے عوض میں انسان سے اس

کا ذہن نکال لوں گا۔ موت کا وجود بھی فنا کر دوں گا مگر اس کے بدلے میں عورت کے لیے مرد

کی کشش اور مرد کے لیے عورت کی کشش ختم کر دوں گا۔“

پھر روشنی بجھ گئی..... اور وہ چاروں خوشی خوشی یہ خبر دنیا میں پھیلانے نکل

پڑے۔ جاتے جاتے انہوں نے حقارت آمیز نظر پر چھائیں پر ڈالی جو ٹہنیوں کو توڑے، فرش پر

بکھری ہوئی گھاس کو سمیٹ رہی تھی۔

اور ایک دن جب پرچھائیں اپنی جھوپڑی کی چھت ڈالتے ہوئے اپنی زندگی کی

اگلی ضرورتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ وہ تمام لڑکھڑاتے، لہولہان اس

نور کی طرف بھاگ رہے تھے جو ان پر کبھی وارد ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ پیر زخمی تھے، کوئی اپنا سینہ

دباے چل رہا تھا اور کسی کا سر بیٹھ چکا تھا۔

وہ سب تھوڑی دیر تک ہانپتے رہے اور پھر اچانک نور نمودار ہوا۔

”کیا انسان نے میری شرائط منظور کر لیں؟“

اچانک وہ سب پھٹ پڑے ”اے لاکھود طاقت! انسان ناشکرا ہے، بھوک بھی چاہتا ہے غم بھی اور پھر موت بھی۔“

نور اور فرزاں ہوا۔ وہ سب اس پر چھائیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”اے لاکھود طاقت! وہ کون ہے؟“

”وہ آدمی ہے!“ نور نے گمبیر لہجے میں کہا۔

نور غائب ہو گیا اور وہ سب منہ کھولے اسے تک رہے تھے۔ اس نے اپنے ماتھے کا

پسینہ پونچھ لیا..... چھت مکمل ہو چکی تھی۔ ●●

## برطرف فاصلے

ہوا بندھی۔ جس نما علاقہ چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے میری نظریں مسجد کی دائیں طرف کھنڈر نما مکان میں ٹھہرے ہوئے بول کے درخت پر ٹک گئیں۔ بول کے خاروں سے اُٹتی ہوئی رات میری بند ہوتی آنکھوں میں اُتر آئی۔ آج سوالات کا انبوہ نسبتاً غیر جسمانی تھا.....

سوال: گراموفون ہینڈل نما گلی کا جزوی خاتمہ مسجد پر ہے۔ مسجد سے عمود گرایا جائے تو رنگ محل ملتا ہے اور وتر کا اختتام کھنڈر پر ہوتا ہے..... فاصلوں کی اہمیت کا تعین کیجیے۔ کیا کیسیاتی تعاملات جغرافیائی تبدیلیوں کو واضح کرتے ہیں؟ نیز کھنڈر کی توضیح ارتقائی نقطہ نظر سے ہونی چاہئے اور کسی بھی قابل قبول نفسیاتی گروہ سے اپنے جواب کو کھولے۔ صفائی کے نہرات میں اس سوال کو شامل سمجھیے کہ آپ کی نظر میں اس پورے سوال کے منطقی و تاریخی عقب میں محنت

کا کیا رول ہے؟

جواب: نفسیاتی گروہ، ہینڈل کو نو مرتبہ اُلٹا گھمائیے (یادوں کا اُلٹا پن ماضی ہے۔ کھنڈر؟ ”کیوں کہ آج تو مارچ ہے۔“ (چھ مرتبہ بھی یہی عمل دہرایا جاسکتا ہے۔ میرا رول نمبر چھ ہی تو ہے۔)

تاریخی فاصلہ، نو سال۔

جغرافیائی تبدیلی، نو برسات، نو سربا، نو گرما = نو (برسات، سربا، گرما)  
اس طرح ستائیس موسم اس تبدیلی کی کرید ہیں اور پھر ستائیس میں بھی نو مقدم رہا۔  
کیسائی تعاملات: نائٹروجن اور ہائڈروجن کے تعامل سے پکلی کڑکی.....

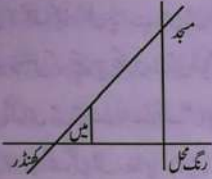
محافظ پانی کا نقطہ انجماد اُبلتا نقطہ ہو کر رہ گیا.....

ہوا کے تیز جھکڑوں سے زیرگی کا عمل قیام پذیر ہوا.....

ارتقائی نظریہ، موجودہ ڈھانچہ (کھنڈر) نو سال قبل ایک توانا جسم (مکان) تھا۔

کیوں کہ

ہر کھنڈر اپنی شکست سے پہلے مکان ہوتا ہے۔ اور شکست و فتح کی ہیئتیں تبدیلی کا نام ہی ارتقاء ہے۔ کوئی بھی تبدیلی، ہر صورت میں خود پر ایسے نقش دھندلائے رکھتی ہے، جس سے اس کے امکانی اصل وجود کا سراغ ملتا ہے۔ چونکہ ہر تبدیلی کش مکش کے کسی زاویہ سے ابھر کر وجود ہت کا پیدا ہوتی ہے، اس لیے محفوظ حفاظتیں (رنگ محل) (مسجد) عام طور پر مٹا ہر ہیں۔  
ارتقائی تسلسل (غیر نامیاتی ارتقاء، جمود ہے) مظاہر سے عبارت ہے جو آدی کی فطری بے چارگی ہے..... رنگ محل انتہائی ابتدا کا اسرار ہو کر بھی یہ عمل دے چکا ہے کہ اس میں خود اس کا کوئی رنگ نہیں ہوگا۔ مسجد، کھنڈر اور رنگ محل کے بیچ ٹھہری ہوئی لاچارگی کی پناہ گاہ ہے۔



زمین ہی مظلوم ہے جو ان تین مظاہر کو اپنے اوپر برداشت کرتی ہے مگر مظلوم میں مجرمانہ جرائم بھی تو ملتے ہیں۔ انتقام کی صورت اس طرح ہو جاتی ہے کہ فاصلے راستوں سے ترتیب دے کے منادے جاتے ہیں۔ فاصلوں کے تعین میں کس کس گناہ کو دہرایا جائے مختصر یہ کہ ہمارے تمام عوامل فاصلوں کے تابع ہیں.....

نی الحال

موجودہ کھنڈر میں غائب اور غائب مکان میں موجود نہیں رہتا تھا..... (ہے)،  
’تھا‘ اور ’ہے‘ کے بیچ ہی سارے ایسے سانس لیتے ہیں۔

نوٹ: معاف کیجیے، میں نے جواب میں خود کو شامل کر لیا ہے۔ محض اس واسطے کہ کہیں لا تعلقی معنویت نہ پیدا کر دے۔

..... آپ کو کھنڈر کی اس شکست دیوار کے عین بیچ (تھوڑا سا بائیں) جو ایما (Amoeba) نما دراز نظر آ رہی ہے، کبھی میرے مکان کی کھڑکی تھی۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھڑکی بھی نہیں تھی بلکہ میری آنکھ تھی، جہاں سے میں رنگ محل کے اندر کود کھینکتا تھا۔  
رنگ محل کے نواح میں محافظ بھاری پانی ہے جو حالت جمود میں اوٹھتا ہے۔ متعدد بار ایسے گواہ دست یاب ہوئے ہیں جنہوں نے آنکھار کر دیا ہے کہ یہ محافظ پانی خود سے علاحدہ کوئی وزن اپنے اوپر برداشت نہیں کر سکتا، اگر چہ وزن تقاضا ہی کیوں نہ ہو لیکن جب کبھی اتفاق سے کوئی



وزن گرا تب ہی اس پانی کا نقطہ انجماد اہل پڑا ہے، اس میں طرح طرح کے نمک ہیں جو اس پانی کو کئی صدیوں سے غیر خالص کر چکے ہیں مگر فیصلہ یہی دیا گیا ہے کہ اس کو کسی بھی عمل سے کشید نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس میں تیرے والے نمک حل پذیر ہو کر اسے کھار کر چکے ہیں۔ اس کھارے پن کو کبھی (جو اس رنگ محل میں رہنا چاہتے ہیں) کو یکساں طور سے پکھنا اور جیتے رہنا ہے۔ میں تجربہ کار نہیں تھا کہ میرے احساسات یہاں تفسی کا پہلو گھسیٹ لاتے۔ اس لیے ایک بے حصول شام کو وقت کے موافق دھارے سے ہٹ کر خود کا ہی زاویہ کھینچ کر، میں نے علاحدہ کرہ بنا لیا، تو بھی میرا تعلق رنگ محل سے منقطع نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ تمام فاصلوں کو ہوا گھیر چکی ہے۔ ہوا جس میں اپنا پن کھوتے ہوئے بھی جینا پڑتا ہے۔ شدید آس کے باوجود میرا تنفس ابھی تک اس خط کو طبعی طور پر نہیں پاسکا، جہاں ہوا میں ہے۔ اس طرح کی سوچ ممکن ہے کہ آپ کو خیالی لگے مگر مجھے علم نہیں ہے کہ آپ بھی اس کیفیت سے گزر چکے ہیں۔ جس کو جان کر بھی جنبش میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ہوا میں نائٹروجن کا وزن نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہوا نائٹروجن سے ہلکی ہے مگر پھر بھی ہر کوئی اس سے مرعوب ہے۔ یہاں تک کہ لامحدود تپش میں شاداں گزرنے والے بھی ہوا سے تجارت کرتے رہے کہ سانس جسموں کی امانت ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ میں نائٹروجن ہوں۔

نوٹ: نائٹروجن، بے انتہا احتیاطی تدابیر سے تیار الکٹریک بلوں میں قید رہتی ہے..... ایک بے احتیاط شام کو آنکھوں میں دھنک کا انکاس نہیں تھا بلکہ رنگ محل کے اندر مخفی ایک رنگ جو خود جلتا ہے اور سورج تک سفر کر کے وہاں روشنی میں رہتا ہے۔ میرا سمجھنا غلط نہیں کہ وہ 'ہائیڈروجن' ہے۔ مگر..... مگر اس کا تو کوئی رنگ نہیں ہوتا! ہمیشہ بے رنگ ہی آنکھوں میں رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنے پن کا۔ اس اپنے پن کے عمل میں کیمائی گرفت

فاصلوں کی سازش سے سہم کر غیر ترکیبی ہونے پر تیار نہ ہوئی..... آخری ٹپ ٹپ کے دنوں میں رنگ کی ترکیب اتنی گہری ہو گئی کہ میرے کان میری زبان کو سننے میں مجھو گئے۔ میں تو ان پیکروں کو بھی خاکستر کر دینا چاہتا ہوں جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن جو میرے اپنے پن کے خواب میں آکر ارتعاش پیدا کرتے ہیں..... کیمائی گرفت بڑھتی ہی گئی اور ایک دن بجلی زور سے کڑکی..... جب تک کہ محافظ پانی اہل جاتا تب تک نقطہ انجماد کے دن آپکے تھے۔ پھر بھی نمک حلالی کیسے بھول پاتے، سو پانی اہل پڑا اور میرے مکان کی دیواروں کو اپنے لگاتار تجھیروں سے منہدم کرنے کی سعی کرتا رہا۔ سب سے پہلے کھڑکی دراڑ میں تبدیل ہو گئی اور آنکھ سے گرتے ہوئے آنسوؤں میں سارا منظر دھندلا گیا۔ دیواریں گرتی گئیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا۔ کوئی نہیں چونکا۔ میری تکمیل کی شکست سے خوش کن تھیڑے فتح کا شور اچھالتے رہے۔ موسم فرقہ پرستی کی طرح نئے نئے رنگ میں آتا رہا۔ ہوا اس وقت بھری جب جھکڑ کے دن آپکے تھے۔ وہ 'عمل' جو ٹپ ٹپ کے دنوں میں ادھورا رہ گیا تھا، ادھورا ہی رہا۔ تیز جھکڑوں نے زیرگی کا عمل قیام پذیر نہ ہونے دیا۔ سچ ادھر ادھر ہی مکان کے پاس گرتے رہے اور انگلیاں اکڑتی گئیں۔ (انتقام بھی اپنے رنگ سے ہی لیا) دھوپ میں انگلیاں کس طرح اکڑتی ہیں؟ جو لوگ رنگ محل کو جان چکے ہیں وہ کسی ایک رنگ میں گرفتار ہو کر یہی کرب کسی اور عمل میں اٹھالیتے ہیں..... لا چاری اتنی بڑھی کہ مسجد کا خیال آیا مگر فیصلہ اس لیے بدلنا پڑا کہ ایک لامحدود فاصلہ تک آواز کیوں لگائی جائے؟ خود کا احساس دوسرے کے لیے شرافت ہی تو ہے۔ مجبوراً دنیاوی ہوشیاری میں، ان فاصلوں کا سفر نتیجے اخذ کرتا رہا۔

سفر: Cosin میں = رنگ محل کھنڈر = رنگ محل = رنگ محل = مسجد

مسجد کھنڈر مسجد

ان نسبت اتنی کٹھن تھی کہ پاؤں سن ہو گئے۔ پھر کوئی بھی غلاظت اور طہارت کو بہ یک وقت ساتھ نہیں رکھ سکتا۔

$$\text{Tan میں} = \frac{\text{مسجد رنگ محل}}{\text{مسجد رنگ محل}} = \frac{\text{مسجد رنگ محل}}{\text{مسجد رنگ محل}}$$

مسجد کی موجودگی میں کمرہ کھنڈر بنا۔ پھر کس غلطی کی تاب میں یہ توقع کی جاتی کہ کھنڈر مکان بنے گا۔

$$\text{Sin میں} = \frac{\text{رنگ محل مسجد}}{\text{رنگ محل مسجد}} = \frac{\text{رنگ محل مسجد}}{\text{رنگ محل مسجد}}$$

{(رنگ محل: کھنڈر)}

جناب محترم صاحب، مجھے صفائی کے نہرات کی اتنی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس سفر میں نے ان لوگوں کو دیکھ لیا ہے جو اجتماعی انیم سے رنگ محل: کھنڈر میں بھی خواب دکھانے پر مصر ہیں۔ خوش آمد خواب..... ”اٹھو اے منتخب قطرو، رنگ محل کا نظام بدل کر رکھ دو۔“ آپ کا کیا خیال ہے کہ غلطی کی موت مرنا زیادہ اچھا ہے بہ نسبت خوش فہمی کی زندگی گزارتے رہنے کے؟ میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس میں خود کو شامل سمجھیے۔ میں ایک اکائی ہے جس کی کہانی بے شمار ہندسوں کی بے اطمینانی ہے یا پھر وہی الہیہ ہے۔ ”چڑیا چچہ ہاری تھیں۔ نئی صبح مسکرا رہی تھی۔ پاس ہی ندی کا پانی اچھل اچھل کر فضا میں ایک عجیب نغمگی پیدا کر رہا تھا اور جس کو سن کر جسم کارواں رواں کہہ رہا تھا، اے ماں۔ اے دھرتی ماں تو کتنی رحم دل ہے۔“ (جیٹ چنگھاڑ رہے تھے۔ مکاٹوں میں تمہاری لاوارث تھی۔ پاس ہی چاروں اور کا منظر بہہ بہہ کر اعصابی تشنج پیدا کر رہا تھا۔ اے ماں۔ اے دھرتی ماں، تیرا کردار بھی اب نیا نہیں

رہا۔“ اس طرح یا اس طرف کی بات اب نہیں کہی جاسکتی۔ تمام بل ٹوٹ چکے ہیں۔ ہر صورت میں آپ اپنے اس بریکٹ میں ہیں۔

ختم شد

کیفیت: ”رول نمبر چھ کو ہمیشہ کے لیے سوالات سے برطرف کر دیا جائے کیوں کہ باوجود کڑی احتیاطی تدابیر کے اس نے کسی طرح میرے سوالات کو پہلے سے جان لیا تھا..... مگر میری خواہش ہے کہ اسے صفائی کے نہرات دیے جائیں کیوں کہ میں خود بھی بریکٹ کے اس طرف ہی ہوں.....“

ہو اقدارے بہ رہی تھی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ جس

●● کا علاقہ معدوم ہو گیا ہے۔

## رخش پا (میں کی زبانی)

پھر ایک دن بادل چھا چکے تھے، ہوا میں اتنی تیزی تھی کہ آدمی کے اندر چھپی ہوئی شخصیت گھبرا کر باہر نکلتی جا رہی تھی.....

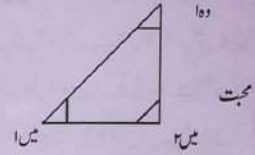
گھر کے آنگن میں ٹھہرا ہوا وہ درخت بڑا کلورڈیل زدہ ہو گیا تھا۔ کلورڈیل میری آنکھوں کے راستے میرے ذہن میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ مجھے بڑی دیر تک اس موسم سے لگاؤ رہا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر فطرت کوئی جتنی جاگتی شخصیت ہوتی تو اس کے گلے میں اپنے بازو ڈالے میلوں پیدل چلا جاتا۔ فطرت کی پرستش میں کہیں نہ کہیں آدمی کی تسکین کا عنصر مخفی ہے۔

اس دن کولوگ ”صحت کا دن“ کہتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں (1) اور میں (2) صبح سے مختلف تیاریاں کر رہے تھے۔ میں (1) میں (2) کا بڑا گہرا دوست

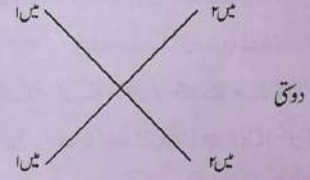
ہے۔ اسی تیاری کے سلسلہ میں جب میں (2) دھوئیں زدہ گھر میں گیا ہوا تھا تو اچانک میں (1) کو محسوس ہوا کہ وہ (1) کا زاویہ اشاروں کنایوں سے اس کی جانب بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میں (1) کے ذہن میں اچانک لفظ ”گولگو“ پھیلتا گیا۔ اپنے لہجے کے اعتبار سے کسی ظالم دیوتا کی طرح دکھائی دیتا ہے جو انسانی خون چوستا ہے، پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ چون کہ میں (1) کو اس وقت لفظوں کی معنویت کا احساس نہیں تھا، اس لیے اس کا زاویہ بھی پھیلتا گیا اور وہ (1) کے زاویہ میں پیوست ہو گیا۔ ”آج تک کوئی زاویوں سے بچ سکا ہے؟“ میں (1) کو اس وقت اس بات کا بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ (1) اور میں (2) میں ایک پوتر رشتہ ہے اور میں (2) اس کا بڑا گہرا دوست ہے دراصل یہ زاویہ ۲۵ بھی اسی وقت شخصیتوں میں داخل ہوتا ہے جب آدمی اس قسم کے احساسات کو محسوس کرے۔

جب میں (2) دھوئیں کو ہناتے ہوئے دھوئیں زدہ گھر سے نکلا تو ایک نقطہ بے علم دکھائی دے رہا تھا۔ میں (1) میں (2) باہر نکل گئے۔ بادل گرجنے لگے میں (1) الیکٹریک تاروں میں اٹکے ہوئے پرندوں کو بے معنی طور پر دیکھتے ہوئے اب بھی وہ (1) کے ۲۵ کے زاویے سے لطف اٹھانے میں مجھو تھا اس کے کندھوں کو دکھا دیتے ہوئے میں (2) نے کہا ”تیز بارش کتنی بھلی لگتی ہے۔“ میں (1) سٹ پنا کر سامنے Octroi Box (چنگلی خانہ) میں گھس گیا۔ میں (1) اپنی قمیض اتارے میدان میں بھینکتا ہوا چلا گیا۔ اچانک میں (1) کو اس بات سے جھرجھری سی آگئی کہ کہیں میں (2) کو ان کے زاویوں کا علم تو نہیں ہو گیا؟ میں (1) کشمکش کی آگ میں جتا رہا اور اس کی نظر بار بار الیکٹریک تاروں میں ڈولتے ہوئے ایک قطرہ پر جارکی، قطرہ کے گرنے کے عمل کا اس کی نظروں نے تعاقب کیا اور جب وہ قطرہ کہیں گم ہو گیا تو میں (2) بھی بھیگتے ہوئے شرابور جسم کے ساتھ box میں پھر سے داخل ہوا لیکن اب وہ ایک

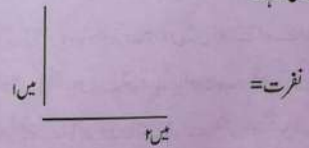
نقطے علم نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں (۱) کو احساس ہوا کہ ”صحت کے دن“ اس نے ایک بیماری پال لی ہے۔ جو ۳۵ کا زاویہ رکھتی ہے۔“ زاویوں کے علم کے ساتھ ہی میں (۱) میں (۲) کے ذہنوں میں الفاظ کے معنی جدا ہوتے اور ملتے ہوئے دکھائی دیے۔



جب بھی ان زاویوں کا اتصال ہوا ہے مثلث ان کا مقدر بن چکا ہے لیکن اس مثلث کی انوکھیت کا نا جائز زاویہ ۹ ہے جو میں (۱) وہ (۱) کے ۳۵ کو دیکھ کر وجود میں آیا ہے۔ اس لیے یہ مثلث معنی خیز ہے۔ میں (۱) میں (۲) کی دوستی اس مثلث سے پہلے یوں تھی۔



اب یوں ہو گئی ہے۔



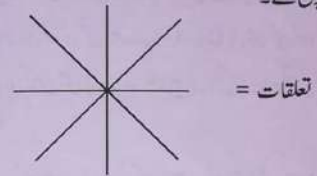
ان کبیروں کے خلا میں وہ (۱) آ گیا تھا۔ خلا کا پیدا ہونا ایک فطری رشتہ کی آگاہی ہے..... میں (۲) وہ (۱) ایک فطری رشتہ سے بندھی دو خون کی تالیاں ہیں اس لیے میں (۲) کی میں (۱) سے برہمی جائز اور کھری تھی۔ مگر میں (۱) وہ (۱) کا رشتہ بھی محسوساتی تھا۔ محسوسات فطرت سے کبھی بھی اور کہیں بھی پست ہو سکتے ہیں۔ اس بات کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔

کالے اور سفید رنگوں کے بیچ ۳۵ کا زاویہ مستحکم ہوتا گیا اور اس میں اس قدر اتصال پیدا ہوا کہ مثلث میں تناؤ آ گیا۔ مثلث کے وجود نے X کے وجود کو کسرت مضم کر دیا تھا اور روز بہ روز کے سائے لہمہ بہ لہمہ لائے ہوتے گئے۔

آنگن میں ٹھہرا ہوا کھورفل زدہ درخت اس قدر پھیل چکا تھا کہ سورج کی روشنی اس کے پتوں میں اسیر ہو کر رہ گئی تھی۔ میں (۱) یہ سب دیکھتا رہا۔ میں (۲) چوں کہ ایک اجتماعی آدمی تھا اس لیے اپنے تناؤ کو قوت دینے کے لیے اس نے ان زاویوں کے درمیان وہ (۲) کو بھی گھسیٹ لیا، وہ (۲) میں (۱) میں ایک خوبی رشتہ ہے اور اس طرح میں (۲) وہ (۱) ایک ہی شاخ وہ (۲) کے پھول ہیں۔ میں (۲) Androcium اور وہ (۲) Gynacium کی جبلت ہیں۔ میں (۲) وہ (۲) نے ہر طرح سے میں (۱) کو ۳۵ کے زاویے پر آ جانے کے لیے مجبور کیا مگر لا حاصل۔ اب انھوں نے وہ (۱) کو اپنی کند میں گرفتار کرنا چاہا۔ وہ (۱) پھڑ پھڑا تار ہاگر ۳۵ کے زاویے نے اس کو اڑان کے لیے تقویت پہنچائی مگر وہ خود بھی ۳۵ کا زاویہ نہ ہو سکا۔ اب وہ (۲) بھی میں (۲) کی طرح ۹۰ کا زاویہ ہو گیا اور ان دونوں نے غصہ میں درخت کے کھورفل زدہ پتے چبائے۔

ایک تیز دوپہر دھوئیں زدہ گھر سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ میں (۲) وہ (۲)

نے طے کیا کہ اپنی کند میں اخلاقی اجسام ہم (۱) ہم (۲) کو لائیں۔ ہم (۱) اور ہم (۲) کے تعلقات یوں تھے۔



میں (۲) وہ (۲) نے ۳۵ کے زاویہ کو ہم (۱) ہم (۲) کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان دونوں کو یقین ہو گیا کہ میں (۱) ہی ۳۵ کے زاویہ کا خود ساختہ علم بردار ہے۔ ہم (۱) کو بہت تکلیف ہوئی، ہم (۱) نے ایک کہاوٹ ”جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید نہ کرو۔“ کو ہر رات سوتے وقت میں (۱) کو رٹایا تھا۔ میں (۱) نے اپنے عزیز ہم (۱) کی کہاوٹ کو توڑ کر بغاوت کی تھی۔ ہم (۲) کو اس بات سے تکلیف پہنچی تھی کہ انہوں نے بھی ایک محاورہ محبت میں سب کچھ جائز نہیں ہے۔“ وہ (۱) کو سکھایا تھا وہ (۱) ہم (۲) کا عزیز ہے۔ میں (۱) نے اپنے مشترکہ زاویہ سے اس دیوار کو ہلادیا تھا جن کی بنیاد میں ہم (۱) ہم (۲) نے اپنے کئی Androcium, Gynacium سے باہم بدل لیے تھے۔ اس کے علاوہ ہم (۱) ہم (۲) کو سب سے زیادہ چیز انفرادی پسند کے زاویوں سے تھی۔ وہ دونوں اجتماعی چوریوں سے ایک نیا زاویہ بنانے کے قائل تھے جو زاویہ سے زیادہ جادہ نقطہ کا کام کرتا ہے۔ پھر ان سبھوں نے اپنے اصولوں کے دائرے سے زاویوں کو قید کر لیا اور وہ یوں ہو گئے۔ لفظوں کی ہیئت بدل گئی۔

میں (۱) = ۳۵

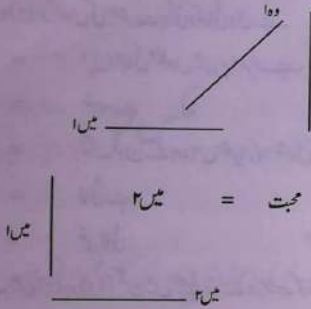
میں (۲) = ۳۵

وہ (۱) = ۹۰

وہ (۲) = ۹۰

ہم (۱) = ۷۰

ہم (۲) = ۷۰

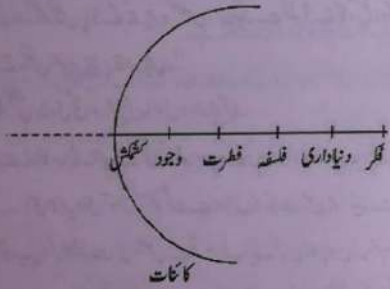


میں (۱) وہ (۱) نے اپنے زاویہ کو قید ہوتے دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ دونوں کسی تاریک جزیرے میں قید ہیں اور ان کے درمیان ہم (۱) ہم (۲) نے ایک خطرناک سمندر لاکھڑا کر دیا ہے۔ اس سمندر میں ہم (۱) ہم (۲) نے اپنے اجتماعی اصول کے خطرناک جانور ڈال دیے تھے، جن کا زہر جھاگ کی شکل میں ان دونوں کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں (۱) وہ (۱) پھر بھی اپنی اس چھوٹی سی لٹی ہوئی ۳۵ درجہ کہستی میں مست تھے۔ ایک دن ”پوتر زنجیروں“ کا تہوار لایا گیا اور میں (۱) وہ (۱) === ہو گئے، چوں کہ اجتماعی حیثیت === کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اس لیے ہم (۱) ہم (۲) میں (۲) وہ (۲) مطمئن ہو گئے اور دن بدن میں (۱) وہ (۱) یوں ہوتے گئے۔

## عکسِ فنا

فرض کیجیے:

وہاں، ایک توہمی ماحول میں ایک ایسی تختی رکھی ہوئی ہے۔



ممکن ہے وہاں کچھ اس قسم کی بات ہوئی ہو۔

جب میں (1) کو وہ (1)، وہ (1) کو میں (1) کا زاویہ ایک علاحدہ روپ میں دکھائی دینے لگا۔ اب زاویہ نگاہ بدل گیا تھا لیکن ۳۵ کا زاویہ پھر بھی انہیں ایک چٹان کی مانند دکھائی دیتا، چوں کہ میں (۲) بھی ہم (1) ہم (۲) اور وہ (۲) کی طرح اب ۳۵ کے زاویے کے وجود کو ختم سمجھنے لگا تھا اس لیے وہ میں (1) کو ایک سمجھوتہ کے تحت X کی طرف راغب کرنے لگا اور اچانک ہی میں (1) وہ (1) کو لفظوں کی معنویت بدلتی دکھائی دی ہے۔

محبت = اپنی انتہائی شکلوں میں پراسرار ہے۔

دوستی = ضرورت

سمجھوتہ = لوگ خون کے بعد اس ہتھیار کو استعمال کرتے ہیں۔

نفرت = فانی ہے

تعلقات = غیر فانی

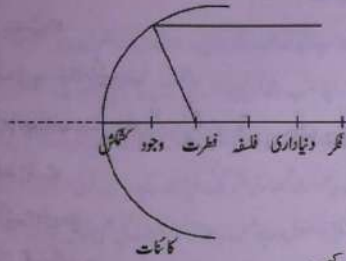
لیکن جب میں (1) وہ (1) آنگن میں پھیلے ہوئے درخت کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہن میں کلوروفیل نظروں کے راستے سے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور انہیں ان باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اگر نہیں مل سکتے تو ایک لامحدود سرجد تک ایک ہی رفتار کے ساتھ اپنے اندر اپنے ۳۵ کے زاویہ کا درد لیے ہمیشہ سفر کرتے رہتے ہیں اور اس سے بڑھ کر ابدیت کیا ہو سکتی ہے۔ ●●

”تم صرف ایک کرن ہو چوں کہ ہم مبداء نور ہیں ہم نے کچھ راز تم میں رکھے ہیں جو تمہاری فطرت ہے۔ ہم تمہیں تمہاری اس فطرت کا راز نہیں بتا سکتے لیکن یاد رکھو ہم اس راز سے خوب واقف ہیں ہم سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس فطرت میں رہ کر جو کچھ کرو گے وہ ہماری ہی مرضی ہوگی مگر اس کے علاوہ جو تم کرو گے اس کو ہم پکڑ لیں گے ہماری پکڑ سے ڈرو کیوں کہ فنا و بقا ہمارے ہاتھ ہے۔ ایک دن اور وہ دن مقرر کیا گیا ہے کہ تم ہمیں لوٹ آؤ گے اس دن ہم تمہارا چہرہ دیکھیں گے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس وقت تمہارا چہرہ کیسا ہے۔ ہم نے چاہا کہ تمہیں اس لامحدود سرحد سے کائنات پر پھینکیں اور کائنات ہم نے ہی بنائی ہے جو تمہیں نظر آ رہی ہے۔ خود کچھ لو کہ ہم نے اس میں ایک وسیع خط کھینچا ہے جس کی کوکھ میں ہی کشمکش ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس خط پر تمہیں کئی فریب ملیں گے۔ یاد رکھو فطرت ہی تمہاری اصل جگہ ہے۔ فطرت پر رہ کر ہی تم اپنا اصل چہرہ دیکھ سکو گے۔ اس لیے کائنات کو آئینہ بنایا گیا ہے کہ تم اپنا چہرہ دیکھ سکو۔ مگر اس جگہ سے ہٹ کر تم اپنا چہرہ بھول جاؤ گے اور سمجھ نہیں پاؤ گے جو چہرہ تمہیں اس جگہ سے نظر آئے گا، مسخ ہوگا۔ ہم مسخ چہرہ پسند نہیں کرتے، لیکن ہم ہر چیز پر قادر ہیں۔“

پھر تختی ہٹادی گئی اور تنویری ماحول دھندلا گیا۔

اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے پہلی دفعہ سوچا وہ کوئی ہے جو محدود ہے کوئی ہے جو لامحدود ہے اور..... اسی ثانیہ وہی آواز: ”تم گر رہے ہو اس کائنات میں جو آئینہ ہے اور تمہارے لیے رزم گاہ، خوب یاد کرو فطرت ہی اصل ہے تم صرف ایک کرن ہو چوں کہ ہم مبداء نور ہیں اور ہم ہر چیز پر قادر ہیں۔“ وہ جھک لے لکھاتا سنتا رہا، تنویری ماحول یکسر ختم ہو گیا۔ کسی چیز کے ٹکرانے سے ایک لمحہ پہلے اس کے ذہن میں ”کیوں“ ابھرا پھر ایک جگہ ٹھہر کر اس نے اپنی تختی

شکل آئینہ میں دیکھ لی۔

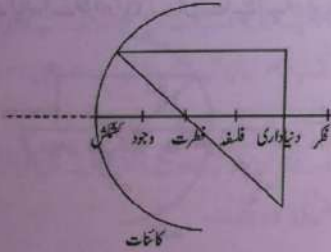


یقین کیجیے:

”اس نے محسوس کیا وہ نیا لہ ہے۔“

لیکن اس نے دیکھا اطراف کا لے رنگ بھی ہیں اور سفید بھی، لال نارنجی بھی ہرے بھی، نیلگوں زرد..... اور گڈ گڈ کرتے ہوئے کئی رنگ، ایک حسد پیدا ہوا وہ کیوں کالا، سفید نارنجی..... اور زرد نہیں ہے؟ ایک تجسس ابھرا، کیا وہ ایسا ہو سکتا ہے.....؟ ایک ہمت پکاری: وہ ایسا ہو سکتا ہے۔

پاؤں میں حرکت، دماغ میں بغاوت، انگ انگ میں ہوس اور دل میں جتو لیے وہ بڑھ گیا، فطرت سے ہٹ کر وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔



آوازیں:

تم میرے بیٹے ہو

میرا ایک باپ ہے اور ایک ماں

میں بھی باپ ہوں

میرا ایک بیٹا ہے

میری ایک بیوی ہے

میری ایک محبوبہ بھی ہے

میرا ایک ملک ہے

مجھے ایک خاص ڈھنگ سے عبادت کرنی ہے

انسانیت، حیوانیت، شیطانت، روحانیت، جسمانیت

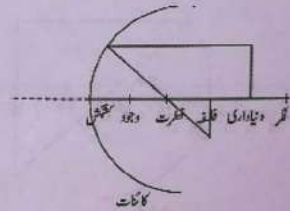
نفسانیت، جنسیات..... ت اور

وہ تنگ آ گیا۔

اس نے دیکھا وہ اٹنا ہو گیا ہے اگرچہ یہاں اس کے قدم و قامت محفوظ تھے۔“ پھر بھی

مطمئن نہ ہوا اور بیزار ہو گیا۔ اس نے سوچا وہ رنگ کہاں ہیں؟

وہ ہٹ گیا اور آگے گھڑا ہو گیا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو دیکھ سکے۔



تشریحات:

”ماں باپ کی خدمت میں دین ہے کیوں کہ انہوں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ پالا پوسا اور جوان کیا ہے۔ اپنا سب کچھ قربان کر کے تمہیں ہر قسم کی سہولت فراہم کی۔ تمہاری خدمت کوئی احسان نہیں ہے اور اس بات کا رتی برابر احساس تمہیں نہیں ہونا چاہئے۔ مقدس رشتوں کے ساتھ لائی گئی یہ عورت تمہاری شریک حیات ہے۔ اب کوئی اور عورت تمہارے لیے حرام ہے۔ وفاداری کا یہی اصول ہے جس سے ازدواجی زندگی بھی خوش گوار ہو سکتی ہے۔

محبت لمس نہیں احساس ہے۔ لمس تو میری جان جسم سے وابستہ ہے اور احساس روح سے جنم لیتا ہے۔ ہم ایک نہیں ہو سکتے اس سے ہماری محبت میں کوئی جمبول نہیں آ سکتا۔ محبت تو اعتماد کے سلسلوں سے بندھی گئی ہے..... اچھا تو کل اسی جگہ ملاقات ہوگی..... خدا حافظ میرے محبوب۔

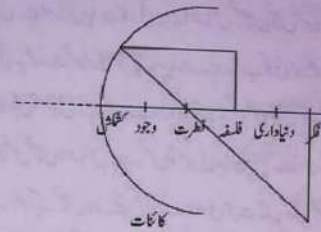
کل کو اور کوئی انگلی نہ اٹھائے کہ یہ میری اولاد ہے۔ کچھ کرنا چاہئے، آخر میں اس کا باپ ہوں اور وہ میرا جگر کا ٹکڑا۔

یہ سچ ہے کہ تمہیں اس کا احساس ہے مگر احساس وہ ہے جو کچھ جغرافیائی حد بندیاں رکھتا ہے۔ حب الوطنی تمہارا ایمان ہونا چاہئے اور ایمان کو محصور ہونا چاہئے۔ اس طرح اسے کھلا مت چھوڑو، دیکھو ایک مثال سنو۔ یہ مت سوچو کسی اور جگہ، تاب کاری سے ایک زبان زہریلی ہو گئی ہے۔ بلکہ یہ دیکھو یہاں کتنی زبانیں دھول سے بد مزہ ہیں۔ احساس کی غلامی ہی حب الوطنی بن جاتی ہے۔

یہیں پر وہ ملے گا کیوں کہ سیدھا اور صحیح راستہ یہی ہے۔ بس اسی طریقہ کار کو رو بہ عمل لاؤ اور عبادت کرو، اس کی، جو ہر جگہ ہے۔



.....ت، یہ لفظ مجھے تابوت لگتا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہی زندگی کی تیرنگیاں ہیں اور وہ تشریحات کی ضمنی تعریفوں سے ہی پریشان ہو گیا، اس نے دیکھا وہ الٹا ہو ہی گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی جسامت گھل گئی ہے۔ وہ سامنے نکل آیا اور ایک جگہ کھڑا ہو کر اس نے دیکھا:



اسراریت:

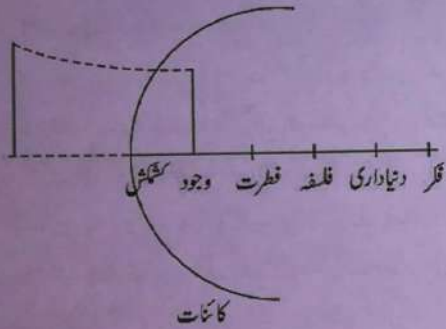
”سب بھائی ہیں کیوں کہ ایک مادہ ایک ہی خون اور ایک ہی روح رکھتے ہیں۔ مادہ، مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا، تاہم ہمیں نظر نہیں آتا، مادہ دراصل قوت ہے۔ توانائی ہے۔ اس لیے مادیت ہی توانائی اور قوت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جن کے پاس یہ سب ہوگا وہی کامل انسان ہوں گے۔“

خون: جب خون سے خون کا اتصال ہوتا ہے اگرچہ وہ اپنا تھوڑا بہت رنگ کھودیتا ہے مگر ایک تیسرے خون کا وجود قائم ہو جاتا ہے جن میں ان دونوں کی خصوصیات کسی نہ کسی نچ سے زندہ ہوتی ہیں اور وراثت کا یہ سلسلہ کبھی نہیں مرتا۔ وہ لاکھوں خون اپنے اندر پہلے، دوسرے، تیسرے..... خون زندہ رکھتا ہے اس لیے خون اچھا ہتھی وراثت اچھی ہوگی۔ خون کے ایسے ہونے کا واحد ذریعہ یقین ہے جن کے پاس یہ سب ہوگا وہی انسان ہوں گے۔ روح: ہیبت کا بدلنا اور دراصل فنا ہی ہے۔ مادہ اور خون اپنی ہیبت بدلتے رہتے ہیں

توانائی کے بغیر مادہ اور یقین کے بغیر خون محتاج ہیں مگر روح نہ کسی کی محتاج ہے اور نہ اپنی ہیبت بدلتی ہے۔ وہ مکمل آزاد ہے۔ چون کہ وہ بے حس نہیں ہے اس لیے متاثر ہوتی ہے۔ وہ تقویٰ ہی ہے جو روح کو متاثر نہیں ہونے دیتا جن کے پاس یہ سب ہوگا وہی انسان ہوں گے۔

اس اسراریت کے کھلے پن سے اس کا سر چکراتار ہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی ہیبت بدل چکا ہے اور اپنی جسامت سے کہیں زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ مگر الٹا ہی۔ وہ اکتا گیا۔

وہ سامنے نکل آیا اور اس جگہ کھڑے ہو کر اس نے دیکھا۔



مخویت:

یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا سب رنگ ایک ہی ہیں اور وہ سب اسی کے لیے ہیں۔ وہ جس رنگ کو چاہے اوڑھ سکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس نے جانا وہ میں ہے اور اس میں اس نے ہزاروں آوازیں سنیں جو اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔ یہاں اسے یقین ہو گیا کہ وہ صرف اس میں سے محبت کرتا تھا اور اسی کے ساتھ اس

کی وفاداری رہی ہے۔ جس کی کوئی جغرافیائی حد نہیں ہے۔ یہاں اسے عرفان ہوا اس نے محسوس کیا کہ وہ ہے اور چوں کہ وہ ہے اس لیے وہ رہے گا۔

یہاں اس نے مانا وہ کئی بار اس ”میں“ کی عبادت کر چکا ہے اور کئی بار اسے ٹھوکر لگائی ہے۔ یہاں اسے احساس ہوا کہ نہ اس کی تہائی میں اسیر ہے۔

ساری کائنات اس کے اندر غلاموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پچھلے سفر کی حکایتیں یاد آگئیں۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور جھلاہٹ بھی ہوئی کہ اس نے اسی راہ پر اپنے قدم اول اول کیوں نہ اٹھائے۔

یہاں وہ سب کچھ جان چکا تھا۔

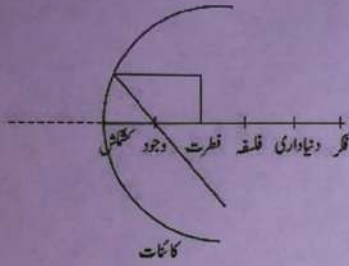
لیکن جب اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا چاہی تو وہ حیران رہ گیا وہ اس کی صورت ہی نہ تھی۔ شاید کائنات کا آئینہ اس کے عکس کو نہیں گھیر سکا تھا۔ پھر بھی اس لمحہ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جہاں بھی ہوگا بلند اور سیدھا ہوگا۔ وہ بہت خوش تھا۔

ایک دن وہ اداس ہو گیا۔ سا لہا سال کی مدت میں اس نے دیکھا وہ بالکل ہی اکیلا ہے۔ اس کے اطراف ایک مہیب تہائی سانس لے رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ پھر بھی مجھے کچھ زیادہ رنج نہیں ہے مگر؟؟!!

ایک فنور اس کے ذہن میں اُتر آیا: آخر وہ کیسا لگتا ہے۔ اتنے سالوں بعد اس کا چہرہ کیا ہو گیا ہے۔

اور وہ ہٹ گیا۔ اسی جگہ بظہر کر اس نے اپنی صورت دیکھنا چاہی مگر وہ لامحدود و سرحد

تک پھیلتا گیا۔



حقیقت: اس کائنات سے نکلنے سے ایک لمحہ پہلے، اور اس کو چھوڑنے سے ایک

لمحہ پہلے، وہ مکمل کیوں بن گیا تھا۔ ●●

## کابوس

قدیم بصر میں آج رات کے ٹھیک آٹھ بجے: ایک عرصہ سے قدامت پسند کابوس نے شیشہ در شیشہ کلوروفل ٹھکانا شروع کر دیا ہے.....  
خود فریبی کے عنکبوتی جالے کو محض معکوس اور اندھی فنا کی یلغار کے مقابل اپمان نہ کرنے کے غم میں ہم قانون بن گئے تھے۔ 7 سال سے روگ، گھن، ادھورے مکان، قانون، شہر، دو شیزنگی غلیظ خون، بے بسی اور قدامت کی سخت گیر تکرار، جانے پہچانے سیاہ سورج کے درمیان ہو رہی ہے۔

دہلی: فی الوقت، زہر، خاموش زکسیت کی گدلی پیلا ہٹوں کو اوڑھے گلی گلی تملسا رہا ہے۔ چہار سوتاریکی کاویت نام ہے۔ جس میں ہم پہلی بار نہیں ملے ہیں۔ کبھی کبھی ایک جاں گسل دھندلی سی مذہال تھر تھراہٹ اس تیرہ فضا میں کا پتی ہے اور تعبیر کی حق تلفی روشنی ذہن

کے تمام حکایت آشوب راستوں میں پھٹ رہی ہے..... تو لیے میں لپٹی رونقیں، فٹ پاتھ، روشن کنکریت، سرکس، آگن، مجلوق چہرہ..... ساری چیزیں ہاتھ منہ دھو چکی ہیں۔  
چہار جانب سکوت۔

گرم آوارگی سے محروم چپ ہواؤں میں فوطزن ہے۔ پانی برس چکا ہے رگ و پے میں وقت کے عذاب لمحات کی آمد و رفت رک گئی ہے۔ ”عجب اعلان سن رہے ہو“ کوئی آواز تھی۔ جانے کیا بات ہے کہ سفر کی اضافی یادیں صعب راہوں کی خوابیدگی اور اٹھتے قدموں کی آہیں..... ہر گھڑی یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم کسی اور طرف ہی نکل آئے ہیں۔

”ہم کہاں ہیں؟“ دھیرے سے اسٹینچ پھیر کر پیٹ پونچھ ڈالو، سفر تھمتا نہیں ہے۔ اس وقت سفر چلتے رہنے کا مطلب یہ بھی تھا کہ مبادا دم بہ خود دانی تعبیر کے محدود تخیلے کا دھواں دیا جائے۔ کیوں آرام اور وہم کے درمیان قیام سے انتقال کا حشر برپا صبر اداں تھا۔ اب یہ اتفاق کسمپاسا ہے۔ ہمارا ملک عجب عبرت سے نشیب میں سرحدیں ملا کر چلتا ہے۔ ہمارے ملک کی دھول بردرا بھیڑ کے لعن طعن، فساد، آرتھو پیڈک اتحاد فشر زدہ اعصاب اور زوال آمادہ ذہن سے سمندر دور ہے۔ ان تمام ذلتوں فشار جماعتوں کی شریانیں ہمارے فعال ریشے ریشے میں جھمکتی ہیں۔ ابھی تک شعبہ سرخ روشنی آسودہ شب کیروں کے حاشیے میں، خواب و خواب عنقریب کو نئے سرے سے، منصف بشارت دیتی ہیں کہ جہاں کبھی ہم بے ارادہ فرض کیے گئے وہیں عادتوں، عمروں، لا علاج مقاصد، سیاہ آفات کی ٹھنڈی چنگاریوں کے نازک بدن غنوغی کا شکار تھے۔ وہ مسابلی مرد جو ہمیں کاغذی و پاؤں میں گھول رہے تھے محض عورتوں کو نہیں نام، سر سبز شوق سے سو گھنٹے میں کئی برس گزار دیے۔ انہوں نے بالا ارادہ مہیب درندہ نگاہ سے مہاشرت کی۔ اس طرح خاکستری پیٹوں کی گھمبیر آنکھ بھی شدید تھیوریٹکس

درد میں غفلت آگ بھری ہے.....!

اب تمام شب ہمارے سروں پر مہیب مصیبت آسمان اپنا فاصلہ بسر ہونے تک کا یوں کو باخبر کرے گا۔ حالانکہ ہمارے میزبان پیٹ بھر چکے ہیں اور جو اس تماشہ میں بسر ہونے سے بچ گئے تھے۔ وہ بے زبان، کثیف خواب کی دلدلوں میں زمانہ عمارت بن گئے ہیں۔ اتنا ہی ذہن کی بے اعتنائی گفتگو کا بہانہ ہمارے آب و خاک کی رگوں پر خلط ملط لکھا ہوا ہے۔ میں ہی کہوں گا کہ یہ ہمارا قصہ ہے۔

ابھی اتنا ہی کافی نہیں ہے۔

شب 2 مارچ: ایک آدمی (اوپر تاجے کا آکاش اور نیچے ریہرسل دھرتی) نفیس لا مرکزیت اظہار میں اپنے خاک دان میں صفر صفر گر رہا ہے۔ وہ تفتوں کے نیچے لتھڑے دپکتے ہونٹوں کی کچکا پھٹ میں غرق ہوتا ہے۔ چند لمحوں کی بات ہے آدمی ابھولوں بنے گونج جاتا ہے۔ کہیں وہ تو میں نہیں ہوں؟

لیکن..... دنیا کے خوف ناک خلیوں میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تو وادی رنگ و بو سے اس قدیم شجر میں آیا ہوں..... میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے ذوقی عدم تشدد کا جواز شہری زندگی کے ایوانوں میں رنگ دیا، انجام کار مضبوط راستوں پر سنگینیاں گلٹی اور جلی کا ٹیلکم بکھرتا تھا (ہے)..... مگر۔

اس سے پہلے ایک تیرہ سنگ محبس میں کچھ جمع کی ہوئی روٹیاں تھیں..... تبھی شہروں کی سمت جاتی ہوئی دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ آج میرا مکان کہاں ہے؟ ممکن ہے دانتوں کی کچکا پھٹ بے کراں شش جہت میں مضصل ہو جائے..... میں خود فریبی کی لاشیں کیے چھوڑوں..... نہیں..... عظیم چھینٹا قریب ہے۔ ●●

نوٹ: افسانے کے سارے الفاظ احمر ہمیش، افتخار جالب اور بلراج کویل کی نظموں

سے مستعار ہیں۔ (ا۔ب)

### تقطیب

آج کا چراغاں رات کے ڈھلنے ٹائیوں سے مسلک ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ جدو جہد کی صبح کل ہماری منتظر ہوگی لیکن اب تو جم غفیر اپنی اپنی تہائی کے تقسیم ہونے کا معروف ترین تماشا اہتاج تک پہنچا کر، پھر سے اکیلا ہو رہا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ تم اس جشن چراغاں میں ضرور آؤ گی مگر یہ رات، رات ہی رہی۔ میدان میں ہوا کے جھکڑ چل پڑے۔ میری نظروں کی تمازت بجھتی گئی۔ تمہارے اور میرے بیچ یہ معلق قید خانہ کیسے اور کب آیا؟ کون سی جدو جہد ان سلاخوں کا مداوا کر سکے گی؟ آراؤی اور..... بس اب یہ بے موقع رومانیت سے آگنا ہٹ سی ہوتی ہے۔

یہ رات اس بقدر نور کی صورت حال ہے جب ہمارے گھروں پر سفیدی نمودار ہوئی تھی۔ وہ دور کہ جب ہمارے گھروں پر سیاہی مقدر کر دی گئی تھی تب کوئی سلاخ نفضا سے یہاں

نہیں اترتی تھی اور چراغ کہیں گم تھے۔

میں نے تین سو بیس سلاخ کو اپنے اوپر محسوس کیا۔ مجھے یاد آیا۔ یہاں گھر کے اس کمرہ میں جہاں الیکٹریک فین گھوم رہا ہے گھر کا سب سے بڑا بوڑھا، ارغڑی کے درخت کی شاخیں سلیقہ سے لٹکایا کرتا تھا۔ میرے اور دادا کے بیچ کی جدو جہد، اتنی وسیع تھی؟ میں فیصلہ نہیں کر پایا۔ ظاہر اور باطن غلط ملط ہو گئے ہیں۔ ہاں اپنے جسم پر میں بیسیوں زخم شہار کر چکا تھا۔

یہ گھر کب تعمیر ہوا تھا اس کا علم ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ اپنی تسلی کے لیے ہم نے سوچا تھا کہ شاید کسی تاریخی گردش کا نتیجہ ہو۔ کوئی نہ کوئی شے کا نجات کی کسی نہ کسی گردش کا نتیجہ ہی تو ہے۔

تم، فلک کی کتنی گردشوں میں، خاک کے کس پردہ سے ابھری ہو۔

پھر میں ہی تو ہوں، جو اپنے اوپر سلاخوں کو برداشت کر رہا ہوں۔ یہ سلاخیں کسی

چکراتے ہوئے ازلی جذبہ کا متعین وقفہ ہیں؟ ممکن ہے یہی میرا حاصل ہو!

کمرے کے دروازہ سے میں نے پھر سے پلٹ کر بندر کو دیکھا۔ بوڑھا بندر۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ بوڑھا بندر بوڑھے گھر کی بوڑھی گھڑی پر لیٹا مزے کی نیند سو رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہمارا گھر سفید ہو گیا تھا تو ہم سب شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ اچانک ہمارے گھر کی ڈھلوانوں میں پھیلے ہوئے ہرے جنگلوں کی بو باس اوڑھے، یہ لال بوڑھا بندر ہمارے سفید گھر میں داخل ہوا تھا۔ ابا نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

بندر ابا کے لیے ورثہ تھا اور میرے لیے گھٹن۔

ایک دن جب میں نیلگہری کے درختوں کے پاس سے مایوس لوٹا تھا تو میں نے بندر کو ایک نئی حرکت کرتے دیکھ لیا، میں سشدرہ گیا، جس گھڑی کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے سفید

دیوار میں ایسا دہ کیا تھا اس کو اس بندرنے وہاں سے بڑی صفائی سے علاحدہ کر لیا اور خود اس پر بیٹھ گیا۔ تب ہی گھڑی کا پنڈولم ساکت ہوا اور گھر میں دھوئیں کی کثیف بو پھیل گئی۔ میں نے چونک کر اپنے گھر کو دیکھا اس میں ہلکی سی پیلاہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔

”سچ کہتا ہوں، تمہارے گھر کا نیلا سکون، چاروں طرف پھیلے ہوئے پراسرار، گمبھیر نیلگری کے درخت، مجھے اپنے سفید گھر کی یکسانیت سے اڑا کر، ہرے بھرے خواب ناک جزیروں میں پھینچا دیتے ہیں..... تم اگھر رہی ہو۔“

گھر کی ڈھلان میں پھیلے ہوئے ہرے جنگل، لال بندر کے غصہ اور چڑچڑاہٹ سے منفی علاقہ کہلانے لگے۔ میں متفکر ہوا۔

آخر، ان سب نے مجھ سے سوال کیا۔ آخر تم ہو کون؟

ہم سب مختلف نہ تھے لیکن پہلی بار میں نے بے جگری سے کہا۔ آپ تمام سے ہٹ کر میرے لیے موت کا قید خانہ کھلا ہے لیکن پھر بھی میں اپنی زندگی کی آزادی کی ریق کو پانے کی جدوجہد میں بھٹکتا ہوا ایک فتح مند ضمیر ہوں۔

دوسرے دن اباسفر پر نکلے تو لوٹے نہیں۔

اب بوڑھا لال بندر گھڑی سے پوری طرح چپک گیا تھا اور گمان ہوتا تھا کہ یہ کوئی دوسرا جانا پچھانا بندر ہے۔ میں دن بہ دن پھیلتی ہوئی دھوپ سے مانوس ہوتا گیا۔ آخر کار جب تمام لوگوں کا خون بہتے بہتے جم کر، گھر کی دہلیز میں ٹھوس شکل اختیار کر گیا تو میں نے اپنے ہاتھ سرخ کر لیے۔

گھٹی اندھیری رات میں پلنگ پر سنہری عورت ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھی۔ میں نے بہ ہر حال سکون کا سانس لیا۔ مجھے اطلاع ہو چکی تھی کہ نیلگری کے درختوں کے پاس کاغذ کی

فیکٹری کا افتتاح ہونے والا ہے۔

بوڑھا بندر بھی سنہری عورت سے والہانہ شفقت کرتا تھا۔ وہ روزانہ اس کے قریب بیٹھ جاتا اور بڑی نیرتا سے اس کے بالوں میں کچھ تلاش کرتا۔

سنہری عورت ہم سب کی جدوجہد کا مرکز تھی۔

کڑکٹی بجلیوں کی ایک سیاہ رات، جب ہم سب سو رہے تھے۔ بندر اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے سنہری عورت کو اس کی اصلی جگہ سے جدا کیا اور اپنی مقررہ نشست کے قریب لٹاتے ہوئے عورت کے کانوں میں لٹکے سبز بندوں کو بے دردی سے علاحدہ کیا اور انھیں ٹھنڈے فرش پر پھینک دیا۔ عورت کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو ٹھنڈے فرش پر گرتے رہے۔ بندر تلخ مسکراہٹ ابھارتا رہا۔

عورت کا بھنبھوڑا ہوا جسم اداس ہے۔ وہ اپنی بریز راور پٹی کوٹ اپنے تھکے ہوئے پیروں سے بار بار اٹھانے کی کوشش کر چکی ہے مگر اس کا لاغر جسم اور ٹوٹی ہوئی کمراسے معذور کر چکے ہیں۔ وہ نفرت بھری نظر سونے ہوئے بندر پر ڈالتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے اس منحوس بندر نے اس کا ایک خواب چھینا چور کر دیا تھا۔

وہ کراہتی ہوئی اٹھی تو اپنے بالکل سامنے ہم شکل بچے کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بچے نے کہا: ”ماں تو اب بوڑھی کر دی گئی ہے۔ میں تیرے تحفظ کے لیے تیرے ہی اندر سے نکلا ہوں تاکہ اس لال بندر کو ختم کر سکوں.....“ بچے آگے بڑھتا ہے مگر اچانک ہی بڑی پھرتی کے ساتھ بندر اچکتا ہوا بچے کو دبوچ کر نیلی دیوار میں گاڑ دیتا ہے۔ مجھے آج بھی اس بچے کی ہمک ان دیواروں میں سرسراہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جب میں نے تیسویں سلاخ اپنے اندر اتار لی تو پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر

چکر رہا ہے۔ تو کیا کوئی تبدیلی ممکن ہے..... ہلکی سی دھندلی دھندلی صبح صحن میں اتر رہی ہے۔

نہیں خوابوں نے مجھے ہمیشہ بلول کیا ہے۔

عورت نے روز کی طرح شرم سے پانی پانی ہو کر نظریں نیچی کر لیں اور اس کے کان بندر کی چٹ چٹ سے گھن آلود ہو گئے۔ وہ اس منظر کو بہت دنوں سے تصور میں دیکھ رہی تھی جو اس گھر کی نیلا ہٹ، زرد علاقوں سے دور، لال بندر سے پرے، ابھر رہا تھا۔

وہ اپنے بچے کو کوئی لباس نہیں پہنائے گی۔

مگر لال بندر اچھل کر اس کے قریب آتا ہے۔ وہ تلملا جاتی ہے۔ مگر اس کی عصمت دری کی کوشش میں بندر لہجہ بہ لہجہ پاگل ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اسے تمام گھر سیاہی میں ڈوبنا دکھائی دیا..... باہر صبح کی روشنی میں منحنی علاقوں پر پہلا ہٹ گہری ہوتی گئی۔

”تم نے بھی اچھائی کیا جو اپنے ہاتھ سرخ رنگ سے رنگ لیے۔“ ●●

## تقلب

دیوار پر، چمکتے ہوئے مقسام سے منقش ٹین کے ڈبہ میں مقید الیکٹریک بشن سے متعلقہ صحن میں ایک متوقع حادثہ اپنی حدت کو چھو گیا۔ ویسے ٹین کے ڈبہ کا ڈھکن کھلا تھا اور الیکٹریک بشن آف۔ صحن میں خوردبینی کالے انگور کا گچھا نما پھل اگانے والا درخت بھی:

آخر کار چڑیل نے درخت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا چونکہ ہم بھی باہمی لاندہبی نطقہ کی چاہ میں باولے ہوئے جا رہے تھے۔ ہرے رنگ کے جیکٹ کو زرد بلاؤزی دھاگہ سے رفو کر لیا گیا.....

ہرا بھرا تھا، سب کچھ معمولاً درست..... مگر یہ دن! ہواؤں کی شرارت پر، جسی اعضاء میں گرفتار سلسلہ کو بالیدہ کیا، اصل میں حادثہ کا موجب ٹھہرا، وہ پھل جو ہوا کی مسیت سے اپنا وجود دھوپ چھاؤں میں منعکس کر رہا ہے، دور سے ایک دیدہ دکھائی پڑتا

ہے۔ ہر ایک دیدہ میں پچاسوں پتلیاں اور ہر پتلی میں صحن اور اس سے منعطف جگہوں کا منظر، کسی غیر مرئی دور میں کے اثر سے قید ہوتا آ رہا ہے۔

صحن میں حرکت کی حاجت زیادہ تر تین تنفس ہی کو محسوس ہوتی ہے۔  
Shock Proof گھڑی باندھا ہوا تھا

Ear Ring سبزین کان

Smoke Coated ہونٹ

ان تینوں کے باہمی تعلقات پر صحن کا فیصلہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی ہاتھ کان کو چھو لے تو تقدس اور اسی عمل کا تصور کسی بھی ہونٹ کے لیے گناہ ہے۔

”نہیں مری جان! کوئی گرفتار سلسلہ ابدی نہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ محبت ایک بے فیض ازلی جرم ہے۔“

”تو پھر دراز کار یہ جہاں، ابدی ہے جانم“

باوجود اس فیصلہ کے تینوں کی جبلی بناوت اپنے اپنے احساس سے عبارت ہوئی۔ سگریٹ کا گھڑی سے جل اٹھنا اور دھوئیں کو ایر رنگ میں تحلیل کرنے کی سعی میں تنہا نشین ہونا اور اس منظر کو تصور میں لائے ایر رنگ کا انگڑائی بھر:

تجلی ہوئی ریت پر رستے ہوئے پٹرول کو دکھ کر اونٹ نے مستی سے انگڑائی لی اور ہر ا پرچم ڈھلک گیا۔ اس کے قدم بچے کچھ نخلستان کی ہوس میں اٹھے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پٹرول منجمد ہو کر کلب بن چکا ہے۔ پوری گن اور جستجو کے ساتھ وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے پاؤں ایرانی قالین کی چھین سے تلملانے لگے۔ شراب کے آخری گھونٹ میں اسے پٹرول کی اس حرام نعمت کا گمان گزرا لیکن مجذوب صحن حسن نے اس کے ہر بالے فلسفے کو ابھرنے سے

پہلے ہی تو یہ صحن دعوت دی۔ وہ اٹھا اور آسن سناستی سلسلہ وراخت کے لطیف نطفہ میں خود اپنے لیے دیوار گریہ ہو کر رہ گیا۔ نزع کے آخری لمحوں میں، کہیں بہت دور سے، کھجور کے درختوں میں ڈوبتی اذان کی آواز سنائی دی۔ وہاں، مسجد میں تنہا چیل ہی تھی اور کلب میں کلثومی لئے صلوات بن کر گونج رہی تھی۔

لینا۔ مگر گھڑی کو دیکھتے تھمتنا اور گھڑی کا ایئر رنگ کی مالیت پر غور کرنا اور سگریٹ کے نقصانات کا جائزہ لینا۔ گئی رات، ہوا نسلیوں سے ٹکرائی کر طوفان بن گئیں، گوچاند میلا تھا لیکن چہار جانب مدوجزر عروج پر تھا۔ صبح خشک آئیز اور شاید دنیا میں ہر طرف درختوں سے پھول پیتاں اور پھل گر چکے تھے۔ تب خود بنی پھل کی پتلی میں گرفتار سلسلہ کی ابتدائی تفصیل۔  
املا راج منظر تھر تھرا ہوا تھا۔

صحن میں آخری کنارے کے دروازے پر کان اور ہونٹ کے رضامند دن YES اور مخرف لمبے NO تحریری اشارے فرض کیے گئے۔ ایک دن ایک متشکی معاملہ میں NO OR YES تحریر کیا گیا تھا مگر براہ اس بارش کا کہ اس نے اپنے فطری ظلم سے اسے ORE کر دیا ہاتھ نے اس تحریر پر غور کیا تو سمجھا کہ ابھی گرفتار سلسلہ کچا ہی ہے۔ تب دم جھم بارش ہو رہی تھی۔ ہاتھ نے درخت کی شاخ پر اپنی شاخ پروف گھڑی باندھ کر، کھڑکی کی اوٹ میں ہوئے متوقع ڈرامہ کے وقوع کا انتظار کرنے لگا۔ الیکٹریکیشن آف اور ٹین کے ڈبہ کا ڈھکن بند تھا۔ درخت کے پتوں پر پہلی سازش پھیل چکی تھی۔ کش لے کر ہونٹ نے کان کو آواز دی مگر وہ جھاگ دار آواز پیدا کرنے میں مصروف اس نے غصہ سے پانی بھرا نچن الٹ دیا۔ کھڑکی کا پٹ مسکرایا۔ گھڑی جھونٹے لگی، ایئر رنگ بے خبر.....  
علاحدگی اور خشک کے لفظ ابھی ابھی تولد ہوئے۔



آنکھ کی پتلی سورج کے گہن کو کھٹا کر خواب نما منظر دکھلاتی ہے۔

..... مری جان! میں نے دیکھا کہ لامحدود خلا میں کان ہونٹ اور ہاتھ تیر رہے ہیں۔ اول اول اچانک ہی ہونٹ ان سے جدا ہوا اور اس خلائے بسیط میں جمیل کے دو کنارے ابھر آئے تب فضا میں پلکتا ہوا ہاتھ جمیل پر گرا اور تب ہی کنا پینا ساحل نمودار ہوا۔ آخری لمحوں میں کان نے ٹھیک ٹھیک اپنا آدھا جسم زمین اور پانی پر گرائے مینڈک کی شکل اختیار کر لی۔

جان، میں نے تم سے کہا تھا کہ ہر دائمی جذبہ (؟) اس تعلق زندگی:

”ہم تعلق میں زندگی گزارتے رہے اور اس دنیا کو فقط احمد آباد سمجھا اور احد کے میدان کو بھول گئے۔“ کی شکلچہ نیز آوازوں سے گھبرا کر، اپنے آپ سے فرار ہوتا ہے۔

آج صبح پختہ ہو چکا ہے اور درخت کی جگہ ایک بڑی ناور گھڑی ایستادہ ہے۔ ٹین کے ڈبہ کا متبادل 1100 VOLTS بورڈ لٹک رہا ہے۔ سنا ہے کسی نئے تمدن نے صحن میں کرایہ کر لیا ہے۔ لیکن اس صحن سے منحرف جگہوں میں آج بھی درخت کہیں نہ کہیں سانس لیتا ہوگا۔ گواہی رنگ نے الوداعی بوسوں سے دور اطمینان آسن کے مسکن میں خود کو چھپایا ہے۔

اور سب چیزیں دفن ہو چکی ہیں پھر بھی گرفتار سلسلہ کی قبر:

ہاتھ کی ہتھیلی میں خارش کی جاگتی ہوں

کان میں ہونٹ کی آواز قریب سے سننے کی لگن

ہونٹ میں مانوس آواز کو پکھنے کی چاہت

ہوں لگن اور چاہت عمل کی طرف بڑھے۔

ہاتھ نے چالیس روپے کپاس میں ڈال دیے۔ کپاس کو کپڑا بننے میں دیر لگتی ہے

جب کہ وہ ان امور میں طاق ہے۔ نتیجے میں نوے روپے ہاتھ آئے اور خارش کا سلسلہ ختم ہوا۔

ایئر رنگ چکراتے چکراتے ٹھٹھک لیں اسے ایسا محسوس ہوا کہ صحن میں مخفی آوازیں اسے دیوچ نہ لیں۔ تھوڑی دور، کرسی پر لا پرواہ دھواں، چوکور کھڑکی سے بل کھا کر نکل رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے اپنے چکرانے کی روداد مٹیا لے کاغذ پر منکشف کر دی اور پھر کرسی کے قریب غیر مسطح کاغذی کڑہ گرا۔ گھبراہٹ میں سگریٹ اسی غیر مسطح کڑہ پر گرا۔ اس سے پہلے کہ یہ یقینی حادثہ لطافت کو ختم کر دیتا وہ چکرانے کی روداد سے واقف ہو گیا اور اٹھا اور صحن میں جھانکنے لگا۔ کان کے انتہائی نچلے حصہ پر رگوں کا کھجور، اسے اتنا بیا راتھا کہ وہ یہی کہہ سکا۔ ”تم“ معطر حسن کا کیا نام ہو سکتا ہے۔ مگر لگن کا مران ہوگی۔

سگریٹ پھینک کر وہ، پانی سے بھرے رنجن کے قریب ہو گیا۔ اپنی طویل سانسوں پر قابو نہ پاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کان درخت کے تنے سے ٹکا ہے اور اس کی لوہیں سرخ ہو چلی ہیں۔ باوجود کہ آج کان کا میلان دن، وہ چاہت کے شہاب ثاقبوں کو پکڑتا آگے بڑھتا گیا اور اپنے دھواں آلود ہونٹوں سے سرخی لگتا رہا۔ دیوار پر دیا نما۔

نیم تاریک تہہ خانہ میں منصوبہ کی آخری سطروں کو دیے کی سیاہی سے رقم کر، اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ جگالی کیے سوچ کا تھا۔ اطمینان کا سانس لے کر اس نے اپنی دم ہلائی اور اپنا منہ عدم تشدد گاہ کی طرف موڑ دیا۔ اس کی غصہ ور آنکھوں میں ہرے پرچم کی بے حرمی کا ماتم کرتا انبوہ تھا۔ اس کے جہڑے جمیل گئے اس کا سویا ہوا ساتھی اگر اسے اس روپ میں دیکھ لیتا تو شاید کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں گاؤں کھیت کھیت، بل اٹھائے، اپنے فرضی باپ کو عملی خراج عقیدت پیش کرتا۔ مگر..... اپنی دم میں دیا اٹھائے، اس نے اپنے سونے ساتھی کو الوداعی طنز سے دیکھا اور دوڑتے ہوئے، عدم تشدد گاہ میں موجود ہرے رنگ پر لال چھیننے برسائے کی تاریخ مرتب کر لی.....!

کھول کر آج بھی یہ منظر دیکھا جاسکتا ہے: ”قبر کے فرش سے متصل دیوار میں سگریٹ ٹھونکا ہوا ہے اور دھواں پھیل رہا ہے۔ دھوئیں کے باعث، ایئرنگ سگریٹ کو اپنے بالہ میں لیے چکرا رہی ہے اور اس عمل کو دیکھ کر فرش پر گھڑی، اچک اچک کر ان دونوں کو علاحدہ کرنے کی کوشش میں اپنا مشینی نظام درہم برہم۔“

”جانم! بچ ہے، کبھی ابدیت میں مبتلا ہونے کا ڈھونگ کرتے رہے اور مر گئے۔“



## اقلیما سے پرے ہو

(پاشاہ کے نام)

.....جب منقلب سوئی کے تاریک دھاگے کا سراختم ہوا تو میں نے ایک کھلی ہوئی دوپہر میں خود کو یہاں پڑایا۔

تپتے ہوئے ذرات سے سارا جسم اٹ چکا تھا ادھ مری آنکھوں سے دور دور تک نظریں دوڑائیں مگر وہاں کیا تھا! ایک میں اور مجھ سے پرے ہو میں لپٹی ہوئی ساعتیں۔  
پتہ نہیں جسم پر کتنی رونیں ایسی ہوں گی جو ایک ایک احساس کو چوکس شکاری کی طرح قید کر لیتی ہیں۔ ان قید خانوں میں تشنگی کی پھرائی ہوئی آنکھ اور اقلیما کا عکس۔ ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ..... جو کبھی نہیں کھلتا۔

باہر کائنات کی ہولناک مسکراہٹ میں فنا کا گیت گونج رہا ہے۔ لیکن میرے عقب میں ان دیکھے قدموں کی کھڑکھڑاتی آوازیں، مجھے ہی ہستے رہنا ہے۔ خواہ وہ نیچر کو سمندر کے

قریب گڑھے کھودتے ہوئے پاؤں ہوں کہ مال غنیمت پر لچائی ہوئی آنکھ۔

علاج دگی تو صرف ایک سراپ ہے۔ ورنہ۔ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔  
چاروں طرف پھیلا ہوا ریگستان، آخر مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ اندر باہر چاروں طرف  
ریگستان۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک جن جن درختوں نے مجھے بے برگ و بار کیا تھا ان  
میں سے کوئی بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ جب اس شاخ سے مجھے پہلی بار کوچ کا مرحلہ نصیب ہوا تو  
وہ دونوں میرے ہم راہ دھوکیں کے رتھ پر سوار نیچے نیچے تتر بتر ہو گئے تھے۔ پھر بھی ہم یک جا  
ہوتے رہے، خشکیں بدل بدل کر۔

شاید وہ جمعہ کی خون آشام سہ پہر تھی..... نیم کے درخت کے پاس آنکھیں میچے وہ  
میرا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے کاندھے سے ہل بھینک کر، میں نے اس کے گلے پر نظر ڈالی وہاں  
خوش نما پھول پتیوں والا خوش نما رومال پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ صاف سنہرے سیاہ لباس میں ملبوس  
ہدایت کردہ سمت میں منراٹھائے ہوئے دہرا رہا تھا  
”جب آنکھوں سے روشنی چھین لی جائے گی اور سمندر کا پانی بانپ اٹھے گا تو اسے  
ان جنس تم کسے پکارو گے۔“

اس کے پیروں کے پاس مقدس قربانی رکھی ہوئی تھی اور پاس کی بہتی ندی میں اس کا  
سایہ لہروں سے کھٹکھٹ کر رہا تھا۔ ”چلو، اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک لمحہ کے لیے میرے  
سینے میں تقریباً ویسا ہی خوف اترا آیا جب میں نے پہلی بار حلق میں ممنوعہ بھل اُتارا تھا۔ مجھے  
محسوس ہوا کہ اس کے دیدوں میں ہری گھاس سے بنی کھڑکی سے روشن اقلیم کا چہرہ تھر تھرا رہا  
ہے۔ وہ قربانی اٹھانے کے لیے جھکا اور فوراً مجھے دھکا دے کر خود بھی اچک گیا۔ سامنے کالا

سانپ لہراتا ہوا ندی کے بہاؤ میں گم ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لیے میں نے سوچا لالچ تو محض شکست  
خواہش ہے۔

پھر بھی ہم دونوں چلتے رہے اور مقرر کردہ آنے سامنے کی چٹانوں پر اپنی اپنی قربانی  
رکھ دی۔ اطراف پتیل کے درختوں پر اسرار اٹکھ رہا تھا..... اچانک جھماکے کے ساتھ ایک  
تیز آندھی کا گولہ وہاں داخل ہوا اور میں نے آنکھیں کھول کر مشتہ انداز میں چٹان پر نظریں  
ڈال دیں۔ مگر میری قربانی وہاں موجود تھی اور دوسری چٹان عریاں، اس لمحہ اس کی آنکھیں سرخ  
ہوتی گئیں، اور وہ اپنے طاؤس نما پاؤں اٹھائے میرے جانب بڑھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے  
سیاہ لباس سے کوئی چمک دار شے نکالی اور میرے حلق سے اقلیم کا خرفرا تا لفظ اس گھومتی  
ہوئی زمین میں چکرا گیا۔ آسمان پر لال دریا پھیل گیا اور فنا کا گیت گونج اٹھا۔

شام تھی۔ میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا کی کرکٹ کسٹری سے فارغ ہو کر سخن میں پہنچا تو  
شہوت کے درخت کے قریب وہ آنکھیں یک ٹک مجھے گھور رہی تھیں۔ حلق سے نکلا۔  
”اقلیم! اور میں شفق آساوادی میں ڈوب گیا۔ وہیں بیت الخلا سے متصل دیوار کے قریب ہم  
نے بدنام لفظ کی دیوار کو آخری اینٹ دے دی۔“

تجھی تجھی گلی میں فائر بریگیڈ گونج اٹھا۔

شفیق آساوادی سے جدا ہو کر جب میں چھت پر پہنچا تو وہاں آسمان پر آگ کی  
بجائے رات پھیل چکی تھی۔ نیچے اترنے تک سخن میں سارے رابلے کٹ چکے تھے اور وہاں  
ایک گوریل جاداوا پر تھرک رہا تھا اس کے سر پر وضو کے بعد کا مرحلہ رسم ہونے کی کہانی  
بکھیر رہا تھا۔ میں سب کچھ جان گیا.....

سامنے ایک دیوار لمحہ لچکتی گئی اور کوئی اندر کی آگ اور دھوکیں کو بھٹاتا ہوا مجھ سے

جدا ہوا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھوں میں ایک کلبھاڑا ہے۔ پہلے ہی وار پر دیوار کے پتھر پتھر جھرا گئے اور وہ دیوانہ وار دیوار پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے سینے میں سارے پتھر ڈوب چکے تھے اور اب وہ بنیاد اکھاڑ پھینکنے کی سعی میں ڈوب گیا۔ پہلے ہی وار پر ایک انچی نکلا، وہ اسے اپنے گلے میں لپیٹنے ہوئے دوسرے وار کے لیے سانسیں درست کرنے، مسلسل واروں کی زد میں مگڑیوں کے جال، چاقو، نمک اور ادھیڑے ہوئے پتے نکلتے گئے اور آخر کار تہہ میں اسے وہ کاغذات مل گئے جس کی اسے تلاش تھی۔ مگر یہ کیا؟؟!! کاغذات پر روشن بدنام لفظ خود اس کے سینے سے بچھ گئے تھے اور صرف بے ربط دستخطیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ جوئے شیر کی عدم حصول یابی میں صبحوں اور شاموں کی تنہائی اب سخت جان ہے۔ انچی اسے ڈس رہا ہے۔ مگر وہ سرگشیز خمار سوم و قیود بھی ہے یا نہیں پتہ نہیں۔ سامنے پھر دیوار آگ آتی ہے اور اس کی منڈیروں پر گور بیلانا چاوا تھر تھرا رہا ہے۔

”قاعت“ میرے منہ سے نکل گیا مگر قاعت کیسے آئے، اپنے اندر کے گرگٹ سے اتنا لڑنا ہوگا کہ بے ہاتھ ہو جاؤں ورنہ اس بے رحم چھلکی میں اپنا وجود ڈالے، قطرہ قطرہ ہونے کا منظر دیکھ پاؤں گا۔ اتنا شاید کبھی کافی نہ ہوگا کہ جنہم آسازندگی کا لمحاتی مداوا کسی اجنبی رات میں اپنی مانوس اداسی اور تنہا چاند میں ڈھونڈوں۔

چاند نکل آیا ہے اور ریگستان ناقابل تسخیر ہے.....

بیچھے، ہادیہ کے سنگ میل کو بگولوں نے چاٹ لیا ہے وہاں سرخ نیزے ریت پر کپٹیل لفظ دائم کرنے میں سرگرداں ہیں۔ اب ان دیکھے قدموں کی بازگشت عادت سی بن گئی ہے۔ چلتے رہنے کے سوا اور کیا ہی کیا جاسکتا ہے۔

ایک اکیلا منتشر انبوہ اور اس قدر کئی بھٹی زمین..... ہریالے فلسفہ کہاں آگتے

ہیں۔ محدودی اور بے راہ روی، کتنے راستے اس بیچ درمیان میں آگرے مگر..... مگر دور شاید ایک چوکور کنواں ہے۔ میں تھکا ماندہ بے فیض وہاں پہنچتا ہوں مگر وہ وہاں بھی چوکور دیوار سے متصل سیاہ و عمامے ذلیل و خوار پڑے ہیں۔ ”یہ حبِ حزن تو نہیں؟ میں نے جواب دیا تھا تیس سال کی عظیم محنت کے بعد جن چھ جلدوں سے ہماری فہم روشن کی اس پر اندھیرا نہیں بھینکا جانا چاہئے۔ مگر سیاہ عمامے اندھرا بھینکتے رہے اور کبھی تو عذاب کی توجیہ کے لیے ایک نسل کا ذہن کافی نہیں ہوتا.....“

وہ منگل کی ایک آکٹا ہٹ بھری رات تھی۔

مدراس کیفے میں پاکستان ریڈیوسن کر جب میں مین روڈ پر نکل آیا تو زندگی رواں دواں تھی۔ سامنے کی عمارت کی بالائی پر نظر دوڑائی تو کینسر کا شرطیہ علاج، بورڈ دکھائی دیا، بس آمیز گلیوں سے گزر کرتا ہوا قبرستان پہنچا تو وہاں ببول کے درخت کے نیچے ایک اونٹ تھکا ماندہ بیٹھا تھا..... مجھے ریڈیو کی خبریں یاد آئیں اور دل ہی دل میں ملی ترانہ گنگناتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ جانے کہاں سے ایک پتھر پاؤں کے قریب آگرا۔ اور پھر چیخ پکار اور نعروں کی گونج میں میرے بدحواس معطل پاؤں ممنوعہ دروازہ میں داخل ہوئے۔ ایک جاوداں تقشقی ہے اور ایک محصور دروازہ..... جو کبھی نہیں کھلتا۔ اب جو بھی ہو کیا جاسکتا ہے۔ پناہ وجود سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اندر داخل ہوا تو حمن میں چاندنی کٹی ہوئی تھی..... یہ یقین ہو گیا کہ یہاں فساد میں ہی ممنوعہ چہروں کا دیدار ہوتا ہے چھت پر پہنچا تو گئی رات تک فائر بریگڈ انجنوں کی نیند ابھی ٹوٹی نہیں تھی۔ حمن میں شہوت کا درخت کاٹ دیا گیا تھا۔

آگ چاروں طرف۔ اندر باہر اٹھ اور لمبوں کے ڈھیر۔

بات عمامے پر رنگ کی بارش سے شروع ہوئی۔

”قلیما“..... چاند کو نکلتے نکلتے مجھے ہوش نہیں رہا اور میں نے دیکھا۔ میری زبان کی نوک ایک وسیع گنبد کے بہاؤ پر تکی ہے اور میرا سارا وجود معلق۔ گنبد کے محدب بہاؤ پر سفر کرتے ہوئے ایک لحد کے لیے میں نے دیکھا کہ نیچے، ایک عجیب انلاقت مغربیت نایق رہا ہے۔ اس کے تلوے ٹینک نما اور نائلیں میزائل آسا اور ان کے درمیان ایک تنگ دھڑنگ عورت لٹک رہی ہے۔ سر پر سواستک نما پیرے لہرا ہے ہیں اور دھڑنگ کی پٹنی زمین کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہاتھوں کے بجائے ایریل پول کنڈھوں سے بڑے ہیں۔ میرے سفر کے اختتام کی چیخ، اس کے حلق میں اتر آئی ہے، اور میں بڑا اگیا، کنویں میں ابھی تک میری چیخ گونج رہی تھی۔ سیاہ عمامے اسی طرح ذلیل و خوار تھے۔ دن نکل آیا تھا میں نے سوچا اگر ہم کسی علاقہ شیبیہ سے ہر اسان تیز گام ہیں تو وقت اور زمان ہمارے لیے کیارہ جائیں گے۔ عذاب کی توجیہ کے لیے ایک نسل کا ذہن کافی ہے؟!

اس ریگستان میں پتہ نہیں کب سے بارش روک دی گئی ہے۔ اب تو میں اس ریگستان میں آجانے کی وجہ سے ماورا ہو چکا ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کس کی تلاش ہے۔ ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ، جو کبھی نہیں کھلتا، مگر یہیں سے گذرتے رہنا ہوگا۔ شاید انسان کی ابتداء بھی خدا کے ظہور کی طرح ایک واقعہ ہے مگر آدی خدا کہاں ہے؟ صرف بے ربطہ دشتیں ہیں مگر سیاہ ورق کی لمبائی کا اندازہ کون کرے.....

قلیما کا کلس اور قید خانوں میں فنا کی گیت۔ اس قضیہ میں مجھے وہ تڑکا اچھی طرح یاد ہے۔ شروع میں اس کی طوالت کا اندازہ مجھے بھی نہیں تھا۔ روشن دان سے منعکس ہوتی ہوئی کرونوں کے احساس پر معلوم ہوا کہ روشن دان سے اس کی جڑیں میرے بستر کی جانب آرہی ہیں۔ دیوار پر ٹنگی آیتیں ہمیشہ کی طرح مجھ سے بیزار تھیں جب وہ پوری طرح میری آنکھوں اور

پھر بستر میں ہیوست ہو گئیں تو اس عمل کے اختتام پر مجھے احساس ہوا کہ گزرا پودا مجھ پر چھا چکا ہے اور میرے ناتولد قطروں سے پرے رات خوش پر اتر آئی تو دروازہ کے قریب مجھے احساس ہوا کہ کیا ان راہوں کا حاصل بس ایک پھلچھلا حقیر عمل ہے جہاں اقلیما محض چند آیتوں کے اعلان میں ممنوع ہے..... اذان کی آواز پر جب میں دروازہ کے روزنوں سے جھانکتا ہوں تو ہمیشہ کی طرح وہ سب اس سردترین دھواں آمیز صبح میں اپنی اپنی پشیمانیاں دھونے میں خشوع و خضوع محسوس کرتے۔ انہیں شاید علم نہیں تھا کہ مسجد کے اس کمرہ میں ایک میلا بستر ہولناک درخت کی زد میں خواستراحت ہے۔ فلاح کے راستے بلانے والی آواز نیند میں تحلیل ہو گئی ہے اور پشیمانی کسی مفہوم میں عبادت معلوم نہیں ہوتی۔ علاحدگی تو صرف سراب ہے ورنہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں اول اول کون سی جگہ گندی ہوئی کیوں کہ ہوش آنے تک تو معلوم ہی نہ تھا کہ لال مٹی کے آگے بھی کنویں، انسان، بازار، تالاب اور پتنگ آباد ہیں۔ غالباً وہ کوئی دو پہر یا پتنگ اڑانے والی شام تھی کہ دھاگہ تن چکا تھا۔ نہ کوئی معبود نہ ہی کوئی عابد، بس ایک انبساط تھا جو یہ محرک خزینے کسی جس زدہ دھوپیلے گوشے، تھمبیر کی اندھیری سیٹ، قبر کا چبوترہ، باویوں کی کمان یا فیصل پر رکھی توپ پرواہ تو ہے تب رٹی رٹائی آیت کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔

بس وہ نسائی آنکھیں یاد ہیں۔

انہیں آنکھوں کو مسرت پہنچانے کے لیے دو پاؤں بے چین رہتے۔ وہیں کہیں ایک درگاہ تھی اور کہیں کوئی پارہ پڑھنے کا منتظر رہتا۔ تب تپتی ہوئی دوپہر میں دو پاؤں درگاہ کھینچتے اور شام سر پر آجاتی۔ موسسری کی آخری شاخ پر دور کے قبرستان سے رات کے آثار پر جلد اپنی

جینیں بھرے، بھاگتے، دو پاؤں دہلیز تک پہنچتے۔ مولسریوں کی منتظر آنکھیں۔ اور میں۔ اور بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی جی چاہتا کہ اس کی مرتش دونوں مولسریوں کو اس سے طلب کر لوں مگر جہرات کا دن آموختہ کا ہوتا۔

لیکن متحرک خزینے کی دریافت میں کالی مٹی ہی سب کچھ ہے کیوں کہ اقلیم اور شہوت کا درخت یہیں نمودار ہے اور میں دیوار کے ساتھ لمبے میں اپنے آپ کو ڈھونڈتا رہا۔

غیب تاریخ کا علم مجھے گھر ہی کے ایک فرد سے ہوا۔ ابھی ابھی سویرا ہوا تھا مگر چہرے پر یک دم کئی سورج گر پڑے۔ گرمی میں، دو پہر، سات گنبد کے قبرستان، کیفے کے گوشہ اور مسجد کے متعفن بستر پر بیت گئی۔ ایک میں تھا اور مجھ سے پرے ہو میں لپٹی ہوئی ساعتیں۔ ایک طویل چپ کا مفہوم یہی نہیں تھا کہ بیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی بلکہ..... تب سے میرے پاؤں سڈو پوڈیا Pseudopodia ہو چکے ہیں۔ اس بیچ کے عرصہ کی تبدیلی میں ایک نامعلوم کتھی کا غنڈہ شہوت کے پتے نمک اور مرکز یوں کے جال سے کس خوف میں مبتلا ہوں اندازہ نہیں ہوتا۔ ہاں اس رات رم جھم تھی۔

مخصوص پاؤں کی دھمک پر آنکھ کھل گئی میں نے ٹین کے نچلے خلا سے دیکھا تو مخصوص چاکلیٹی رنگ نظر آیا۔ حالاں کہ چاندنی اس رم جھم میں بھی صاف اور شفاف تھی۔ رم جھم تھی کہ جسم میں اتنی چلی گئی۔ گندگی بہا دینے کی حاجت تو محض حرکت کرنے کا ایک جواز تھی۔ سر ہانے، دائیں طرف، برف افسانہ کا دوسرا ورق اُلٹا ہوا تھا۔ میں اٹھا واپس ہوتے ہوئے احساس تھا کہ سب کچھ ناکام ہی رہا۔ کسی نئی آیت کو پڑھنے کی ضرورت عرف عرف کی بوکھلاہٹ میں ناکام رہی۔ لیکن شفق آسا وادی اور کھسار، مچھلیوں کے آئینہ مجھے گلے لگے ہوئے پر

مجبور کر چکے تھے۔ جب ٹین کے پترے سے کٹ کر صبح میرے چہرے پر گرمی تو رضائی میں چھپی میری آنکھیں صحن میں موجود ایک طویل سٹائے سے سرا سیمہ..... "اٹھو، رضائی کے اُلٹے ہی ایک طمانچہ کا احساس ہوا اور اخلاقیات کے ورق اُلٹتے رہے۔ گویا عرف کا اظہار غلط نہیں تھا۔ میں ایک نامعلوم کتھی کے خوف میں مبتلا ہوں؟

کتا میں پھینک کر میں گھر سے بس اسٹائڈ کی طرف دوڑا..... اچانک راستہ چلتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ چلتی ہوئی بس میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ سامنے پولیس اسٹیشن ویران، لال مٹی کا وطن خموش..... پائیدان سے نیچے پاؤں رکھتے ہی سٹخ زمین پر ایک قبر طلسم انگیز طور پر ابھری، اگلا پاؤں نکلنے سے قبل پھر ایک قبر کا اضافہ، میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، گاؤں میں اداس مجرم شام کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ قبروں کی درمیانی جگہ پر سے میرے پاؤں گھر تک کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ گھر کی چوکھٹ پر بھی ایک قبر موجود تھی۔ پھر اندر داخل ہوا تو صحن، باورچی خانہ، بیت الخلاء پرانا حجرہ کبھی قبروں کے مسکن تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا تو کیا عرف عرف کا وقوعہ.....؟ چھت پر بھی قبریں موجود تھیں۔ منڈیوں پر ٹمہر کر میں نے دور تک نظر دوڑائی، مگر آدمی کوئی نہیں تھا۔ قبریں ہی قبریں۔ آسمان پر لال بھبھو کا سورج دور مولسری کے درخت پر گر پڑا تھا۔

میں نے سوچا ممکن ہے وہ سب رات کے نیلے سے برآمد ہوں اور جو کچھ اپنے اندر طمانیت کی روشنی بچی ہے وہ بچھ جائے گی اور پھر..... دور دور تک الٹ کر پول اور بل کے نیچے نندی..... میں کب یہاں سے جدا ہوا تھا؟  
دوسرائی آنکھیں یاد ہیں حادثے زوال آمادہ نہیں اور فنا کا گیت گونجتا ہے کہ تخلیق میں مصروف ہے؟ پتہ نہیں۔

کاش میں ہمیشہ کی طرح یہاں مولسریاں توڑتا رہتا مگر کتابوں نے میرا جسم چاٹ لیا ہے۔ اب یہاں ایک وحشت ناک بو ہے اور میں بھاگ رہا ہوں۔ واپسی میں کالی مٹی کی خلق کردہ آگ ٹھنڈی ہو جائے گی؟..... زندگی اس قدر اجنبی ہو جائے گی کہ منقطع دستخطوں میں اپنا مفہوم ڈھونڈے گی۔ یہ میں نے کب سوچا تھا قبریں میرے تعاقب میں ہیں اور میں بھاگ رہا ہوں۔ اسی تنگ دود میں گڑھے میں گر پڑا ہوں اور پورا سفید پوش کچھ پڑھتے ہوئے مجھ پر کنکریاں پھینک رہے ہیں۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا ہوں اور میرے قدم ریگستان میں ڈھنس جاتے ہیں۔

سورج نصف النہار پر ہے۔ دور ایک درخت نظر آ رہا ہے۔ شام تک شاید نہ پہنچ جاؤں، تو کیا پیروں کے نیچے پڑا ریگستان ہی واحد حقیقت ہے اور اقلیم؟؟!!  
چلتے رہنے کے علاوہ اور کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

آسمان پر لالی چھاتے ہی مجھے اس درخت کے سوا تک نہماپتے نظر آئے۔ مگر یہ کیا؟..... ”یہ شجر زقوم تو نہیں؟“ پھل انسانی سر کیسے ہو سکتے ہیں!! درخت کے نیچے ہتی ندی سے میرا سایہ کوئی کشمکش نہیں کرتا، ایک سحر ہے کہ جس کی زد میں اڑتا ہوا تھے میں سایا جا رہا ہوں۔ ایک ان جانی وحشت میں پیچھے اچھلتا ہوں تو پلنگ کی ریڈنگ سے ٹکراتا ہوں۔ ریڈیو پر کسی معابد پر دستخط ہونے کی خبر نشر ہو رہی ہے اور سامنے بھائی اسٹیلکس کے اعداد و شمار میں گم، رفق حاجت کے لیے اٹھتا ہوں مگر گھن میں کھڑا نیم کا درخت میرے قدم روکتا ہے۔ تنے سے سر نکالے آنکھیں میچے، ہدایت کردہ سمت میں منہ اٹھائے، دہراتا ہوں۔

”جب آنکھوں کی روشنی اچک لی جائے اور..... ●●

### ادھورا پیہیہ

..... یہ جگہ باعثِ یاد ہے۔

پتہ نہیں ہا ہی میں کتنا عرصہ بیت گیا۔ کل جو بچی تھی، آج زندگی کے تسلسل میں معاون ہو چکی ہے۔

پہلے کی بات ہے کہ میں برسات کی چاندنی، سرما کے دھوئیں اور گرما کی دھول میں آوارہ ہوتا تھا۔ مگر اب تو پیہیہ مکمل کرنے کی دھن ہے۔ لیکن پیہیہ کی لگزی کو جانے کہاں کی دیکھ چاٹ گئی.....!

”ہم سب تنگ ہیں۔“

ایسے میں اس جگہ وہ ہنسی یاد آ جاتی ہے۔

اس جگہ سے ملتی میری دکان ہے اور پچھواؤڑے مکان۔ اسی جگہ وہ رہتی تھی۔ اب

یہاں پبلک پیشاب خانہ ہے۔ ہمارا گاؤں وسیع ہو چکا ہے۔

وہ لوگ کھدر بنایا کرتے تھے۔ بھائی کا ارادہ تھا کہ بہن کسی سرکاری ملازم سے بیانی جائے۔ ان دنوں میں آوارہ تھا۔ میرے والد لڑکی کو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے مگر دادی اپنے بی خانمان میں میری شادی کرنے پر یہ ضد ہو گئی اور میں اس کی ہنسی سے حیران تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی گول گول آنکھیں گھما گھما کر ہنستی۔ اس روز برسات میں گھر کے قریب بہوت ہوا۔ وہ اپنی سہ رنگی بیٹیوں والی کھڑکی کے عین وسط میں بنے جھروکے سے اپنی گول آنکھ نکالے ہوئے تھی..... پیہیہ!

ہماری اپنی بازیافت اور تکمیل کے لیے مجھے پہیہ مکمل کرنا ہی ہو گا تاکہ اسے ہم صحیح صحیح سہ رنگی سطح تین وسط معلق کر سکیں گے مگر یہ دیکھ.....

ہما ہی میں کتنا وقت نکل گیا.....

اس کی مٹکی کے دن میں شہر بھاگ آیا۔ کالج چھوٹا۔ یہاں پہنچ کر میں نے کام سیکھا مجھے کلوی تراشید کچھ شاعر دوست کہتا تم علاحدہ ہو کہ بازار سے مختلف ڈیزائن خلق کرتے ہو..... پیہ نہیں اب وہ کہاں ہے۔ شاعر..... سنا کہ اس نے آنکھیں کھودی ہیں۔ شہر میں روزگار تھا مگر صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ دھواں، آوازیں، فیشن، وطن واپس لوٹا تو اس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی معمولاً ہنسا کرتی۔ شاید اس کی ہنسی سب کے لیے تھی۔ یا شاید فطرت۔ میں نے دکان کھول لی۔

اس روز گاؤں میں فساد ہوا۔ اس کا شوہر جوشیلا تھا۔ بے جگری سے لڑا اور مر گیا۔

یہیں اسی جگہ اس کا خون بہا تھا جہاں میونسپلٹی نے پبلک پیشاب خانہ بنوایا ہے۔

فسادات کے آگے پیچھے وہ کہیں گم ہو گئی۔ میں اسے دیکھ ہی نہیں پایا، حالانکہ وہ

یہیں کہیں تھی۔ پھر مجھے اس دوپہر سکتے سا ہوا تھا۔ وہ لڑکی جس کی آنکھیں بڑی بڑی گول گول تھیں جو ہمیشہ ہنستی تھی..... یہ وہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں، سکڑی سکڑی، پتلی پتلی ہو چکی تھیں..... پیہیہ کے اندر کا دائرہ.....

سرما کی ابتدائی صبح جب میں پیہیہ کی آؤٹ لائن ڈالے لکھ پہنچا تو پڑوس میں ویرانی تھی۔ وہ اور اس کے نگران اپنا تمام اثاثہ چھوڑ کر کہیں چل دیے تھے۔

آج بھی وہ ہر جگہ مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی گول گول آنکھیں لحد بہ لحد چھوٹی چھوٹی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جب یہ احساس اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو میں اپنی دیوانگی اور فن کاری، اس دیمک زدہ لکڑی پر صرف کرتا ہوں کہ کسی طرح پہیہ مکمل ہو جائے اور ہم اسے سہ رنگی سطح پر مکمل کیے اپنی بازیافت اور تکمیل کو دیکھ سکیں مگر..... مگر اندر کا چھوٹا دائرہ باہر کے وسیع دائرے سے دیمک کے باعث بڑ نہیں پاتا۔



یہ جگہ باعث یاد ہے.....



## آگینہ

تجد کے آخری لمحوں میں وہ جاگ گیا۔

باہر کا پہلا شور مل کی آواز میں ابھرا۔ کھڑکی سے لمحہ کے لیے لاری دندنا گئی۔ کمرے میں اندھیرا اور سناٹا جوں کا توں تھا۔ تب ابتدائی لمحوں ہی میں وہ جاگ گیا ہوتا تھا..... جب چاند کی بے حس سطح پر کوئی جاندار پاؤں نکالا، تھا اسی لمحے، وہ، اسے ساکت اور منجمد کر کے کہیں چل دی تھی۔ اب اس کی تمام زندگی سوٹ کیس میں بند تھی۔ پتہ نہیں کتنے زمانوں کی نیند وہ سوتا رہا۔ اس نے ٹٹولتے ہاتھوں سے آئینہ اور شیونگ بلیڈ تلاش کر لی تھی۔ شیونگ کا عمل جاری تھا۔ آئینہ کی چٹکی صدمہ کٹار سے خود بینی تصویر بھلملائی..... شہر کے میناروں سے اذانوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ اس کے منہ سے آہ تک نکل نہ سکی، گال سے خون بہہ نکلا۔ تب بھی سحر کا وقت ہی تھا، جب وہ کہیں چل دی تھی اور وہ ساکت اور منجمد ہو گیا تھا..... یہ تمام عرصہ جاگتا

ہوا لگتا ہے۔

اب اس کے خون میں قہر کا سناٹا موزون ہے۔

صفر درجہ کے گمان پر اس کے پاؤں لمحہ کے لیے مکان کی دوسری میزمرگی پر رک گئے۔ نیم دھند کا اس کے اطراف سے ہوتا ہوا، وادی میں اور گہرا ہو گیا تھا۔ پہلی ہی بار محسوس ہوا تھا کہ ہمیشہ کی طرح باہر ایک تیر خیز روشنی ساتھ ساتھ رہے گی۔ سو اس کے پاؤں اٹھ ہی گئے۔ پتہ نہیں کتنی ہی بار ایسا ہوا تھا۔

اس طوفانی کہر آلود صبح سے بے نیاز ایک کسان، بل کی گئی زمین میں بیچ ڈالنے میں لگن تھا۔ اس کے پیچھے شہر کا بڑا پاور ہاؤز کھر میں بھلملا رہا تھا۔ اس کے پاؤں شہر کی سمت اٹھے اب کسان کو گمان ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں یہ مسافت کتنی ہے۔

اس روندی ہوئی ٹھنڈی سڑک پر سفر ہوتا رہا۔ لاریاں اپنا اپنا مال دنیا کے ہر حصہ میں بانٹتے ہوئے تیزی سے بھاگ رہی تھیں..... پتہ نہیں اور کہاں کہاں.....

ظہر کا وقت نکل گیا تھا۔ اخباروں کا پردہ ہٹا کر، وہ کمرے میں داخل ہوا۔ آئینہ کو دروازے میں رکھ دیا، کرسی اور میز کھوکھلی ہو چلی تھیں۔ کتابوں کو بھی دیمک چاٹ رہی تھی..... اور جانی بیچانی تصویروں سے آئینل پینٹ اتر رہا تھا۔ دفعتاً وہ بے چین ہوا اٹھا تھا کہ اس نے باہر کا بورڈ دیکھ لیا تھا لیکن کھلی دراز میں اپنی تصویر کو دیکھو بیٹن چپکا بیٹھارہا اور پھر چونک اٹھا۔ باہر نیم پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی۔ گمان میں چلتے ہوئے لوگوں کی ہنسی کی آواز ابھری۔ پتہ نہیں یہ دیمک کب لگ گئی تھی۔

افطار صفر کی رفتار سے کھجوروں میں سموٹی جا رہی تھی۔ وہ اپنے مکان سے یوں ہی نکل پڑا۔ راستہ پھولوں کے انبار سے اٹ گیا تھا، معلوم نہیں کس درخت کے یہ بے مصرف

پھول تھے۔ سامنے الیکٹریک پول سے بیل چھٹی ہوئی تھی۔ گلی کے سنگ سیلو فرش پر یہ بیل کیسے آگ آئی؟ شاید فرش کے نیچے زمین ہوگی ہی!! اسے دور تک اپنا کوئی قدیم دوست نظر نہیں آیا..... سامنے آتا ہوا بوڑھا، آنکھ اور کان نہیں رکھتا۔ پتہ نہیں اس بات کا احساس اسے کچھ پوچھنے سے کیوں روک دیتا ہے۔

ہوسکتا ہے اس کے لوٹنے تک یہ بیل بھی سوکھ جائے!

سائرن نے چاروں حواس معطل کر دیے۔ صرف ہمیشہ کی طرح لذت باقی تھی.... میناروں سے کیوٹر آر پکے تھے۔ وہ بھی بہر حال افطار میں شامل ہوا۔ بہت سے لوگ چاند کے گمان کو چاند کچھ بیٹھے۔ اس نے خشوع و خضوع سے نماز پڑھنا چاہی مگر نماز پڑھ لی۔ کسے پتہ تھا کہ اس کا جسم سائرن کی آواز سے زیادہ آنکھیں رکھتا ہے۔

رات آگ کی تلاش میں بھاگنے لگی۔ اس نے تمام سیڑھیاں پار کر لیں۔ بلب روشن کر کے اس نے آئینہ اٹھایا، اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کم از کم آج کے دن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

تہجد کے آخری لمحوں میں بھی وہ جاگ نہیں پایا۔ ●●

## اندیشہ

..... یہ مکان باعث اندیشہ ہے۔

مناسب اندھیرا ہو گیا ہے..... پھر بھی..... اب کہاں جایا جاسکتا ہے۔ ایک مبہم سی امید کہ وہ موجود نہ ہوگا۔

خوف کی دیوار مسلسل کون چڑھے..... عرصہ ہوا، ایسا سب کچھ ٹھیک لگتا تھا مگر اب پھسلنا..... اور پھر پستی۔ کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ پتہ نہیں نیچے کیا ہو۔

صبح سے ہی تھر تھرا ہٹ تھی۔ پہلے..... پہلے گرد پوانگلی..... پتہ نہیں آتا ہٹ کا یہ عرصہ کیسے بیت گیا.....! عادت بھی تو زندگی کا ایک سلیقہ ہے مگر اتنے دنوں بعد صبح ہی اس کی آمد نے تھر تھرا ہٹ پیدا کر دی تھی اور پھر خوف کی دیوار۔

زندگی کی یکسانیت نے چڑھنا بھلا دیا ہے۔

دو پہر: گارڈن میں محاسبہ نے ایک تمثیل سمجھائی۔ دنیا میں پیٹ نہیں کتنے بھول ہیں۔  
چینیلی، گلاب، گل، مہر، کنول، گل اکبر..... خوش بو یاد ہی تو ہے۔ ہواؤں میں مگر یہ کہاں۔  
خوف، محاسبہ، اور جاہر ہوا، ان کی آگہ کار ہے۔ خوش بو مگر سیاہ سفید جیبوں میں بند۔

قبضہ گیری کا سورج کبھی اوجھل ہوا ہے؟

ہوایہ کہ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ خٹک پر اسرار ماحول، دلہیز کے قریب  
میرے پاؤں ایک لمحہ کے لیے رکے۔ اندر یا باہر، تذبذب طاری ہوا۔ مگر اندر تو جانا ہی تھا۔  
اندیشہ یہ تھا کہ وہ اب تک بھی موجود ہوگا۔ خوف یہ تھا کہ بہت سی یادیں روکی نہیں جاسکتیں۔  
صبح ہی صبح اطلاع ملی تھی کہ وہ آچکی ہے۔ عرصہ بعد گاؤں کو شہر یاد آیا۔ یوں محبت بھی  
ایک مقید عرصہ ہے مگر یہ لگاتی ہونا نہیں چاہتا اور نہیں ساری داستانیں پیچیدہ ہو جاتی ہیں۔  
اب پیٹ نہیں اتنے دنوں میں دنیا میں کتنے سیلاب آئے اور تھم گئے۔ اور کیا کیا ہوا۔ مگر میری  
دیوانگی اسی لیے تو میں نے عادت کو زندگی کا سلیقہ بنا لیا تھا۔ عادت میں محاسبہ کی گنجائش کہاں؟  
مگر صبح کی تھر تھراہٹ نے کیسی اتھل پھل پھادی تھی۔

مکان کے اندر دبے پاؤں داخل ہوا۔ سنانا۔ شاید وہ دوسرے کنارے سب کے  
ساتھ تھا۔ اس کنارے پر، ادھر، میرا مطالعہ کائنات میں لانا بسا کمرہ..... اندر داخل ہوا تو  
ایک دوسرا خوف، آنکھ ملانا مشکل، خواہ مخواہ تم.....

کیا ہوا؟ دودھ ہیٹ پر رکھے ہوئے اس نے میرے چہرہ کو فور سے دیکھا۔

”ادنبہ..... صبح سے کہاں تھے آپ؟“

ایسے ہی کچھ..... بچی سوئی؟

ہاں..... مگر وہ..... وہ کافی انتظار کر کے چلی گئی۔

جواب کیا دیتا۔ اطمینان کی لہروں میں بچی کے پاس پہنچا۔ خوف کی دیوار ڈھ گئی  
تھی۔ دیر تک نیند میں ہی اسے پیار کرتا رہا۔ اچانک نیند میں، بچی بڑبڑانے لگی، ”بندن“.....  
مڑکڑ میں نے اس سے کہا، آئندہ اسے جالوروں کے تماشے سے دور رکھو۔ کمرہ میں ابلے ہوئے  
دودھ کا سنگیت گونج اٹھا۔

یہ مکان باعثِ اندیشہ ہے.....

### کوچ

..... یہ سفر باعثِ خوف ہے۔

پچی کچھی، معدوم ہوتی روشنی سے اب بھی بلی کا قبضہ گھپ خاموشی میں کرسی سے ہو کر، یہاں قبرستان تک بڑھتا چلا آ رہا ہے۔  
ہمیں نے اپنی اپنی کرسیاں کیے بعد دیگر چھوڑ دیں۔ اور اب ایک کرسی جو وہاں دور رکھی ہوئی ہے۔ سب کی میراث کہلاتی ہے۔  
سانے، ذرا سادور، میدان ہونے کی کہانی ہے..... اور اس کے آگے یقینی صبح، جہاں ہم کو پہنچنا ہے تب ہی ہم نے طے کر لیا تھا کہ اس سفر کے لیے قبرستان کا راستہ زیادہ مفید ہے کہ دوسرے راستوں پر ہماری زندگی کی پہچان اہل ہو جایا کرتی تھی.....  
جن جسموں کے لیے یادگار وگ جذباتی تھا، وہ سب یکا یک قبروں سے چٹ کر

رونے لگے۔ اگرچہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جن قبروں سے وہ چھٹے ہوئے ہیں وہ قبریں واقعی ان ہی کے رشتہ داروں کی ہیں!! اس کے جواب میں ان سب نے ایک ہمہ گیر رشتہ کی یاد دلائی تو ہم آگے بڑھ گئے۔

اب بھی ان سب کے رونے اور ان کے قبضہ میں ایک متضاد کیفیت کا احساس واضح تھا۔ تاہم کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ انہیں روک کر کہتا کہ تم پیچھے ہوتے جا رہے ہو۔ مگر پیچھے..... بہت ہی پیچھے جہاں سے ہم نے کوچ کی تھی، ندرات ہے اور نہ ہی صبح، بس ایک مصنوعی روشنی کا سیلاب جو کبھی اٹھا تھا تو ہمیں نے اپنی کرسیاں چھوڑ دی تھیں اور تب ہی آنکھیں میچ گئی تھیں۔

ان لحوں اور آنے والے موسموں میں ہمیں اپنی کتاب اور ہاتھوں کا کچھ بھی خیال نہیں آیا.....

ایک طویل دھونیں کے بیچ کسی نے کہا یہ روشنی ہی خطرناک ہوئی۔ اس لیے کوچ کا مرحلہ کس طرح اچانک وارد ہوا اس کا صحیح صحیح علم ہمیں نہیں ہے۔ بعد کو قبرستان کے قریب معلوم ہوا کہ مشورہ دینے والا معذور ہے اور اسی لیے ہم نے باری باری اپنے کندھے اس معذور کے لیے بدل لیے۔

ایک معذور آدمی کی جان دار کرسیاں ان گنت تھیں اور وہ جو سب کی میراث ہے۔ اس پر سرخ بلی کا واحد اور ناقابلِ تسمیر قبضہ ہو چکا ہے۔

بچپن میں ہمیں نے یہ کہانی گھڑی تھی کہ بلی شیر کی خالہ ہوتی ہے۔ پتہ نہیں یہ کہانی کب تک دہرائی گئی۔ یہاں تک کہ شیر کو موت نے آ لیا۔ تب ہی معلوم ہوا تھا کہ یہی شیر نہ صرف یہ کہ ہماری اولادوں کے لیے دوسرا خود ساختہ باپ ہے بلکہ واقعات میں یہ بلی کا بھی خود

ساختہ باپ تھا..... لیکن ہمیں نے کبھی یہ مظہر بھی دیکھا کہ شیر کی خفیہ گاہ میں ایک سرخ، دھاری دار، سوکھی سیاہ کھال تہا پڑی تھی اور جس کی یاد کو ہم نے شش چہت کبھیر دیا۔ پھر اچانک تیزی اور سائنٹفک طریقہ سے ہمارے لہلہاتے پودوں، بل کھاتی بیوں اور تار درختوں کو کاٹنا جانے لگا۔ علی الصبح اخبارات نے اپنے صفحات دھوم دھام سے سیاہ کیے اور شدید ترین دھوپ میں اپنے بے آواز اداروں میں نباتات کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی تھی۔ پیچھے بہت پیچھے کا ورق ہے کہ ہمیں اپنی کرسیوں سے لڑکھڑاگئے اور چکاچوند کرنے والی روشنی میں آگئے۔ روشنی کے اس سیلاب سے ایک طویل جسم کے دکڑے ہونے کی گونج دور دور تک گونجی تھی اور کافی خون بہا تھا، ہمیں نے یہ مان لیا تھا کہ واقعہ ناگزیر ہے۔

تب ہم نے اپنے نامولود بچوں کے لیے یہ جگہ مناسب خیال کی کہ اس بات کا تین واضح تھا۔ کرسی سچی کی میراث ہے۔ مگر جب ہمارے بچے تعلیم گاہوں سے پلٹ پڑے تو ہمیں نے دیکھا تھا کہ یہاں بھی سرخ سانپ لیا بار بیڑیوں میں موجود ہیں۔ آفت روزگار کے مارے ہم نے اپنے بچوں کو بازاروں سے واقف کروانا چاہا مگر وہاں آویزاں سائن بورڈس نے ہمیں بھگا دیا۔ ہمیں کی اولاد سچی اور غیر جذباتی ہوگئی۔

ایک دن: وقت کے کسی وقفہ میں انھوں نے ہمیں سے پوچھا کہ روایت میں کوئی تلوار اور حقیقت میں ایک کتاب تمہارے ہاں تھی۔ وہ اب کہاں ہے۔ ہم بوکھلا گئے۔

ابتداء ہی میں تعلیم کا علم غلط تھا۔

پھر آئے دن کے اندھیروں اور جالوں میں ہمیں نے محسوس کیا کہ ہمارے کمر بند اور دوپٹے غائب کیے جا رہے ہیں۔ گھٹنوں کے شور میں تھکن اور اداسی ہمارے قلوب تک کھسک آئی ہے۔ ہمارے بچے کیفوں اور نگہداشت خانوں میں اچھوت ہو گئے اور جنھوں نے

سائیس محفوظ کیں وہ کرسی کے زیر سایہ نغمے گانے لگے۔ آوازوں سے ہم بچ نہیں سکے۔

اب اس معذور آدمی کا خیال ہمیں انوکھا لگا اور کوچ کا مرحلہ طے ہوا۔ وہاں جہاں حقیقی صبح تھی اور بیچ کا قبرستان پار کرنا تھا۔

صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ہمیں اسی معذور آدمی نے مطلع کیا کہ اسے اب کندھے سے اتار دیا جائے۔ ہمیں ایک سکتہ سا ہوا کہ اب بھی ہمارے پیروں تلے طویل قبرستان تھا۔ کتنے قرون کا قبرستان تھا لیکن ہمیں جھرجھری اس لیے بھی نہ آئی کہ معذور آدمی کے گلے میں لگی ہوئی زنجیر کی باگ تلی کی خوں بار آنکھوں سے منسلک تھی۔ ہم بے اختیار قبروں سے پلٹ گئے اور اپنے بچوں کو یاد کیا، جواب بھی کیفوں اور نگہداشت خانوں میں بے سدھ ہو کر بھی اپنی روایتی تلوار اور حقیقت آمیز کتاب کی بازیافت کرنے کی سعی میں ٹوٹ گئے۔ ●●

پڑاؤ

”آخر کیوں میں نے اس عذاب میں خود کو مبتلا کر رکھا ہے۔“ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے کھولتے ہوئے خود سے پوچھا۔ برآمدے میں ہوا کا سرد جھونکا میرے چہرہ سے گذر گیا۔ کنٹوپ میں نے پہن رکھا تھا۔ دالان میں پاؤں رکھتے ہی سردی کا سرد احساس موزوں سے ہوتا تو لوں تک پہنچ گیا۔ ابھی تک دھند لکا پوری طرح مسلط۔ خلاف معمول اماں جاگی نہیں تھیں ورنہ وہ جب معمول مجھے ٹوکتیں۔ آنگن میں میرا سفید اسکوئر نیم کے پیلے پتوں سے پوری طرح ڈھک سا گیا تھا اور سارے آنگن میں نیم کے پیلے پتوں کی چادری بچھ گئی تھی۔ موسم پت جھڑ ہے۔ جوتے پہن کر میں نے آنگن میں بڑی آہستگی سے اپنے پاؤں رکھے۔ پتوں کی چرچاہٹ ابھری، سامنے نیم کا درخت ننگا کھڑا تھا۔ ساری شاخیں لڑمڑمزی ہو گئیں تھیں۔ اوپر ہی اوپر کھرے کی چادری تھی۔ آسمان دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے اپنا اسکوئر صاف کیا۔ ہتھیلیوں پر نمی اور آری نماتپوں کی چھن کا احساس ہوا۔ اسکوئر کو آہستگی سے ڈھکیلتے ہوئے میں نے گھر کا آخری دروازہ کھولا۔ گمان گذرا کہ اماں کی آواز پیچھے سے نہ ابھرے۔ گلی میں

سناتا تھا۔ اسکوئر کھڑا کیا اور آہستگی سے دروازہ بند کیا اور اطمینان کی سانس لی مگر ذہن میں یہ خیال آیا۔

”کیا یہ عذاب کلثوم کے لیے تھا!“ مجھے یہ بہت حد تک بے معنی سا لگا۔ ”تو پھر کیا اس عذاب کا تعلق ستیش سے ہے؟“ مجھے یہ بہت حد تک بے معنی سا نہیں لگا۔ اسکوئر سٹارٹ کرتے ہوئے مجھے یہ خدشہ لگا رہا کہ گلی کی مسجد سے کوئی آواز نہ لگائے۔ اسکوئر سٹارٹ کرتے ہی تیزی سے گلی کو پار کیا۔ سرد ہواؤں کے تھپڑے چہرے اور سینہ پر وار کرتے رہے۔ دوسری گلی کے موڑ پر میں نے اسکوئر روکا۔ اسکوئر سے ملحقہ بیگ سے سوئر نکالا۔ اپنے سینے کو ملتے ہوئے امکانی گرمی اور راحت پیدا کرنے کی کوشش کی اور سوئر پہن لیا۔

میرے سینہ پر سے اپنا تھکسکوپ ہٹاتے ہوئے ڈاکٹر رحیم نے اپنا چشمہ درست کیا۔ تب تک میں سینہ سے شرابور ہو چکا تھا۔ فین بھی بند تھا۔ ہر روز کی طرح غالباً بجلی چا بھکی تھی۔ آج گرمی بھی معمول سے زیادہ تھی۔

”میں نے تمہاری رپورٹس دیکھ لی ہیں۔ شوگر کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بھی کنٹرول میں ہے۔ یونیورسٹی میں Yellow Fever بھی نہیں ہے۔ جس کے خدشہ میں تم یہاں آئے ہو۔ ہر چیز نارمل ہے۔ ہلکا سا انفیکشن ہے۔ مگر..... وہ پھر اپنا چشمہ درست کرنے لگے۔ میں ہمدن گوش تھا۔

”مگر تمہیں سگریٹ کم کرنا ہوگا۔“ انھوں نے میرے سینہ کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے سگریٹ چھوڑ دی ہے۔“ میرے لہجہ میں افتخار تھا۔

”کب؟“

”ہمیشہ ہی“ انھوں نے ہاتھ گھماتے ہوئے اشارہ کیا۔ ”کیا میری ڈپنٹری کی ساری دیواروں پر تمہیں کوئی بورڈ نظر آتا ہے۔“  
”کیسے بورڈ؟“

”کیا تم نے کبھی ڈاکٹر کوٹھاری، مونااری، اناری..... کے مطب کی سیر نہیں کی ہے۔ اردو کے لکچرر صاحب..... ایک انبوہ کہ گرفتار ہے جاری عذاب میں“ انھوں نے سلام کرتے ہوئے دانت نکالے۔

”عذاب“ اسکوٹرسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے روڈ میں جست کی۔ کولتاری لائبریری سڑک نم آلودگی۔ شاید شبنم بھی کافی برس چکی تھی۔ سامنے فٹ پاتھ پر آباد ہولوں میں روز کے شناسا چہرے دکھائی دیے۔ یہ لوگ بے فکرے تھے یا فکر مند، پتہ نہیں چلتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی فکر کوئی الجھن ہی انہیں اس سرد موسم میں گھر سے باہر کھینچ لانے میں محرک رہی ہوگی۔ جامع مسجد کے کٹے پر لوگ ہاتھ پھیلا پھیلا کر کسی بات کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دو ایک کے سلاموں کا اشارے سے جواب دیا۔ اب سڑک پر بائیسکلوں کی قطاریں درس گاہوں کی طرف رواں دواں تھیں۔ میں نے کلتوم کو دیکھنے کی سعی کی مگر لا حاصل، ایک تو اس کی بائیسکل کارنگ گہرا فٹکسی اور دوسرے دور دور تک گہرا کھرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹ آن کی۔ مجھے اپنے بدن پر ہزار ہا گدے، زرد مینڈکوں کی گدگد اہٹ کا احساس ہوا، گویا میں کھرے کے اندر ہی اندر تھا مگر یہ دور دور تک ڈولنا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر اپنے گرد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آدمی جس شے میں گرفتار ہوتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتی اور جس شے میں اسے گرفتار ہونا ہے وہ دکھائی دیتی ہے۔ میں نے سوچا ایک لمحہ کے لیے میرے ہاتھ کاٹنے، میں نے اسکوٹر کو بریک لگائی۔ زرد گدے مینڈکوں کا جھوم میرے چہرے کو نم کرتا گذرتا رہا۔

”کوئی..... کوئی آٹھ روز سے“ میری آواز میں لرزش تھی۔  
”دیکھو میاں“ انھوں نے اپنا چشمہ میز پر رکھتے ہوئے کہا ”سگریٹ نوشوں کے ذہن میں ایک پیلا حلقہ نمودار ہوتا ہے۔ سا لہا سال کی سگریٹ نوشی سے“ وہ خاموش ہو گئے۔  
”پھر“ میں نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
”پھر یہ کہ یہ Yellow Ring سگریٹ ترک کرنے کے بعد نو سو ایک دن میں غائب ہو جاتا ہے۔“

”کیا یہ کوئی جدید تحقیق ہے۔“ میرے لہجہ میں تسخر تھا۔  
”نہیں یہ میری تحقیق ہے۔“ ان کے لہجہ میں فخر تھا۔  
”مگر آپ تو دماغ کے ڈاکٹر.....“  
”ہاں ہاں میں دماغ کا ڈاکٹر نہیں ہوں۔“  
”پھر دماغ میں Yellow Ring“  
”دماغ میں نہیں بلکہ ذہن میں Yellow Ring نمودار ہوتا ہے۔“ وہ میری بات کاٹے ہوئے مسکرائے۔  
”پھر مجھے؟“

”ہاں میاں! تم کو ابھی آٹھ سو بیانوے دن سگریٹ چھوڑنا ہوگا۔“ انھوں نے کرسی سے اٹھ کر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میری ایک ہدایت گرہ میں باندھ لو۔“  
”وہ کیا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔  
”تمہیں زندگی بھر سردی سے بچنا ہوگا۔ ماسٹراٹ انور میاں۔“  
”آج آپ بڑی فرصت میں ہیں۔“ میں نے یوں ہی بات کاٹی۔

میں نے رک کر چہرہ صاف کیا۔ سڑک کی داہنی گلی اور پھر گلی کی بائیں طرف گلی کے وسط میں منور جناب کا حویلی نما گھر تھا۔ کیا میرا اس وقت وہاں جانا مناسب ہوگا؟ میں تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں سڑک پر کارہا۔ کل دوپہر جب میں اپنی آئرس کلاس ختم کیے نکلا تو کینیڈین کے قریب سے آواز آئی۔

”سر“ آواز میں کچکا پھاٹ محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

”سر۔ اٹو چاچو آپ کو پوچھ رہے تھے۔ دادا ابو کوکل ہی حیدرآباد سے لائے ہیں۔

بشری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”کبھی طبیعت ہے اب“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”وہ..... دادا ابو کا دایاں جسم منفلوج ہو گیا ہے“..... وہ رونے لگی، میں

مزید کچھ کہنے سے بغیر آفس کی طرف نکل گیا۔ شرم اسپرینٹڈنٹ سے مومینٹ رجسٹر طلب کی اور

Exit Time کا اندراج کیے باہر نکلا۔ جاتے ہوئے بائیں پر نظر دوڑائی پھر لائبریری کے

اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ اسکوٹر نکالتے ہوئے الیکٹریک پول کی طرف دیکھا۔ فٹنسی رنگ

بائیکل موجود تھی مگر کٹوم نظر نہیں آئی۔ زرد رنگ کا اسکوٹر بھی موجود تھا۔ میں منور جناب کی

طرف روانہ ہوا۔ جناب کی اور میری عمر میں کافی تفاوت ہوگا پھر بھی میرا زیادہ وقت ان ہی کے

ساتھ گذرتا رہا تھا۔ وہ اس جاگیر کے سربراہ آوردہ اشخاص میں سے ایک تھے۔ جھریوں سے بھرا

سرخ و سفید روشن چہرہ، علم کا پیکر تھا۔ ان کی تیز طرز اور بھوری آنکھیں، چہرہ کا سب سے جاذب

نظر حصہ تھیں۔ یوں لمبی ستوان ناک لبوترے چہرے کا آہنگ بنائے رکھتی۔ لمبے اڑتے سر کے

بھورے بال، ان کی وجاہت میں اضافے کا باعث تھے۔ آواز میں بلاکارعب تھا۔ مخاطب کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنا انھیں پسند تھا۔ میں نے کبھی انھیں اس ترقی پذیر شہر کو نام

سے معنون کرنے نہیں سنا۔ وہ اسے ہمیشہ جاگیر کے نام سے یاد کرتے تھے۔

”بالکل“ انھوں نے اپنی کہنیوں کو گاڈ ٹکلی میں گاڑتے ہوئے اپنی کرسی سیدھی کی اور

کہا، ”میاں یہ جاگیر، تاریخ میں کئی حکم رانوں اور تہذیبوں کی آماج گاہ رہی ہے۔ یہ کئی بار چڑی

اور کئی بار لمبی اور.....“

”قطع کلام معاف لہ..... شربت پنی لیجیے۔“ اطہر بابا نے شربت کا گلاس

مجھے بھی دیا اور اندر چلے گئے۔

..... ”اور میں بتا رہا تھا کہ یہ ایڑا دیار، آخر کار تاج دار دکن نے اپنے دور کے

داماد، جاگیر دار نواب ڈاکٹر حسین خاں صاحب کو پھر تھنڈ“ یہ جاگیر“ عنایت کیا اور اسے ان کی

عقل داری میں دے دیا۔ نواب صاحب کے ہم راہ ان کا خاندان بھی بہ حیثیت اتالیقی یہاں آیا

اور مختلف عہدوں پر کار گزار رہا۔ یہاں تک کہ پولیس ایکشن کا حادثہ رونما ہوا۔“

”پولیس ایکشن کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس ایکشن ہماری حماقتوں کا جواب، غیروں کی سازشوں کا شاختہ اور غفلتوں

پر وقت کا تازیا نہ تھا۔“

”کیسے؟“

”دیکھو میاں۔“ انھوں نے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تاریخ

شاہد ہے کہ اس طرح کے حادثات میں ہر طرح کا خون خراب، لوٹ مار، عصمتوں کی بے حرمتی،

عبادت گاہوں پر حملہ، حاکم وقت کی بے بسی..... معمول کی کارروائیاں ہیں۔ مگر.....

مگر“ وہ چپ سے ہو گئے۔ مجھے بے چینی ہی محسوس ہوئی۔ ایک طرح کا گھس دیوان خانہ پر مسلط

ہوا۔ میں نے سگریٹ کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھائی انھوں نے تہمتا تہ چہرے کے ساتھ ایک لمبا



کش لیا اور گویا ہوئے۔

”مگر یہ کد امن کے اعلان اور اس کے قائم ہو جانے کے بعد بھی دہشت کا ماحول، آئے دن کا معمول بن گیا تھا۔ شریفوں کا گھر سے نکلنا محال کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں ایک ہی کام بلا خوف و پشیمانی مسلط کیا جا رہا تھا۔ ”قبضہ گری“ انعامی زمینات ہڑپ لی گئیں۔ اوقاف کی جائیدادوں کو اپنے نام منتقل کر لیا گیا۔ لاتعداد عمارات و آثار پر قبضہ کیا گیا۔ کوئی شنوائی نہیں۔ بس چہار سمت دہشت اور خوف کو منظم اور منصوبہ بند طریقہ سے طاری کیا گیا تھا۔“ انھوں نے سگریٹ کی راگھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ بہت دیر تک وہ خاموش رہے اور سورج میں ڈوب گئے۔ میں نے اجازت لی اور باہر نکل آیا۔ دور بہت دور بوڑھا تھا کا ماندہ سورج نیلے کی اوٹ سے ہانپتا دکھائی دیا۔

اب یہاں دھند اور کھرا چھٹا دکھائی دے رہا تھا۔ سورج کی زرد کریمیں کھرے کی چادر میں چھید کرنے لگی ہیں۔ دو پہر ہی کو چانا مناسب ہوگا۔ میں نے کنٹوپ بیگ میں رکھا اور اسکوٹرا آگے بڑھا دیا۔ کالج کا پھانک پوری طرح کھل چکا ہے۔ اسٹاف گیراج میں میں نے دیکھا زرد اسکوٹرموجود تھا۔ باہر نکلا تو سامنے الیکٹرک پول سے فنگسی رنگ بائیکل ٹی ہوئی ہے۔ آفس میں ابھی کوئی آیا نہ تھا۔ میری کلاس کے لیے ابھی وقت تھا۔ اس عرصہ میں ستیش مجھ سے زہر خند لہجہ میں کہتا رہا تھا۔ ”یارتہ تو ہمارے واچ ڈاگ ا کلرک ا لکچر رہو گئے ہو۔“

میں نے الماری کھولی۔ اڈمیشن رجسٹر اور فارم کو میز کی ٹرالی میں رکھا اور بے صبری کے ساتھ کچھ پیوٹر روم کی طرف بھاگا۔ کالج کے سبزہ زار میں بنے راستوں پر رنگ برنگے لباس میں تیلیوں کی مانند، اسٹوڈنٹس کلاس روم کی طرف رواں دواں تھے۔ پتہ نہیں کیوں کالج انتظامیہ ڈریس کوڈ کے مسئلہ کو برسا برس سے ٹالتا آ رہا تھا۔ میں نے دو ایک کی وٹس کا ہاتھ کے

اشارے سے جواب دیا۔ باغ کے کئی حصوں پر اشوکا ٹری سنسٹریوں کی مانند ایسا دہ تھے۔ میں بخ زدہ رینگ کے سہارے میڑھیاں چڑھنے اور کمپیوٹر لیب کے دروازہ کے قریب رک گیا۔ اندر آٹھ دس اسٹوڈنٹس اپنے اپنے کمپیوٹر پر ٹکا ہیں جمائے موز اور کی بورڈ پر مصروف کار تھے۔ میں نے ننگیوں سے دیکھا ستیش کلثوم کی پشت پر کھڑا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں آگے کچھ دیکھنے کا حوصلہ جٹا نہیں سکا۔ وہ اب چوتھے سیمسٹر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

”بس صرف ایک سمسٹر کی ہی فیس لیجیے گا۔“ جواد صاحب کے لہجہ میں درخشتی تھی۔

”اگم سرٹفکیٹ“ میں نے فارم بھرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ذرا بیگ سے نکالو بیٹا۔“ انھوں نے اپنی لڑکی سے کہا۔ تب میں نے ایک بار کلثوم کو فور سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی غلافی آنکھوں کے سوا اور کوئی چیز یاد نہیں رہتی۔

”یہ لیجیے“ جواد صاحب نے سرٹفکیٹ میری طرف بڑھایا۔

”اگری کلچر لیہر؟“

”اور نہیں تو کیا؟ ہماری پانچ ایکڑ زمین تو آپ لوگوں نے اونے پونے دام میں ٹھگ لی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے انور صاحب بڑا لمبا قصہ ہے۔“

”جی اگری میری عمر کا اس سے کیا تعلق؟“

”وہی تو۔ آپ کو علم نہیں نا۔ یہ جو آپ کے کالج کی لمبی چوڑی بلڈنگ ہے۔ یہ جو آپ کی لیبارٹریز ہیں۔ یہ جو آپ کا لمبا چوڑا پلے گراؤنڈ ہے نا۔ سب کچھ ہماری انعامی زمین پر

ہے۔“

”آپ نے سچ دی ہوگی۔“ میں نے فارم بھرتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں سچ دی اونے پونے۔ کیا کرتے۔ ابا مرحوم کہتے تھے انھیں کچھری طلب کیا گیا تھا۔ ایم ایل اے موجود، کمشنر، تحصیل دار، انسپکٹر پولیس، تلامٹی پتہ نہیں اور کون کون..... سب ٹوٹ پڑے ابا پر، کہ یہ انعامی زمین ہے۔ حکومت جب چاہے اسے واپس لے سکتی ہے شہر کے ڈیولپمنٹ کے لیے، اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اس نیک کام میں تعاون کریں اور زمین ہمارے حوالے کر دیں۔“ وہ ہانپنے لگے۔

”مگر یہ حکومت کو نہیں بیچنی گئی۔“ میں نے کہا۔

”وہی تو۔ حکومت نے تو پہلے ہی ہماری اجازت کے بغیر زمین کے ایک حصہ پر کیونٹی ہال بنوا لیا تھا۔ اور انتظامیہ دھمکی دے رہا تھا کہ ساری زمین کو ایکوا کر لیا جائے گا۔“

”پھر یہ زمین کون.....“ میں نے اپنی زبان روک لی۔

”حکومت کے سارے کارندے آپ کے سوامی جی کا کام کر رہے تھے صاحب اور بالآخر ہماری زمین اونے پونے دام آپ کے سوامی جی کے ٹرسٹ کے حوالے کر دی گئی۔“

”ڈیولپمنٹ چالان رسید“ میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ لیجیے۔ پورے پندرہ ہزار کی ہے۔ مگر بڑی مشکل سے پرنسپال صاحب راضی ہوئے ہیں۔ پورے پچیس ہزار مانگ رہے تھے۔ میں نے اپنی زمین کی بابت کہا تب کہیں بچی کے داخلہ پر راضی ہوئے۔“

میں نے رسید لی۔ کل ہی ایک داخلہ فارم دس ہزار کی رسید پر داخل ہو چکا تھا۔

کلوٹم کے کھٹکھٹانے تہہ تہہ پر بڑا کر میں نے ریٹنگ سے ہاتھ اٹھالیا۔ گھنٹی بج چکی

تھی۔ سٹیش سرخ جیکٹ پہنے میری طرف آ رہا تھا۔

”بہت دیر سے ہو اور ان بے جان چیزوں میں دلچسپی لے رہے ہو۔ اس نے جگت تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مگر یار، سچ بات یہ ہے کہ کالج اس تالاب کے کنارے نہ بنایا گیا ہوتا تو اس کی خوب صورتی زیر ہوتی۔ کیوں؟“

میں خاموش رہا۔ اس کے کالے چمکتے چہرہ کے ہاؤ بھاؤ دیکھ کر ہی میرا خون کھول رہا تھا۔

”اچھا۔ تم کو ایک بات بتانا تھی۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کانوں پر رکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”یار..... دیکھو بھڑکنا نہیں..... میں صرف اپنی معلومات تم سے شیر کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہوں“ میں نے کہا۔

”یار تم لوگوں میں یہ کیا رواج ہے کہ تمہاری لڑکیاں شادی سے پہلے برا Bra نہیں پہن سکتیں۔“

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ سارا دن کوفت میں گذرا۔ کینٹین میں ہی دوروز کی رخصت لکھی اور اسے شرماء کے حوالے کر کے گھر آ گیا۔

دوسرے دن دیر گئے تک یوں ہی سوتا رہا۔ سر میں انگلیاں پھیرنے کے احساس پر آنکھیں کھولنا مناسب خیال کیا۔ اماں تھیں۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ اماں نے روک دیا۔ ”چل ہاتھ منہ دھو لے ناشتہ تیار ہے۔“ اماں نے کہا۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اماں سے پوچھا۔ ”ابا کی کوئی اطلاع آئی پندرہ روز تو ہو گئے سب کو جا کر۔“

”ابھی آٹھ دن رہیں گے وہاں۔“ اماں نے جھلاہٹ سے کہا۔

”کیوں؟“

”پھنسا لیا ہوگا خود کورشتہ داروں کی پشتینی جائیداد کے جھیلے میں“

ناشتہ سے فارغ ہو کر میں نے نیم کے درخت کو دیکھا۔ پت جھڑنے اس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں منور جناب کے حضور چل دیا۔

منور جناب کا دایاں اور بایاں حصہ پوری طرح مفلوج ہو چکا تھا۔ ان کی شعلہ بار آنکھیں ماند پڑ چکی تھیں۔ میں ان کے سر ہانے دیر تک ان کے بالوں میں انگلیاں بھیرتا رہا کہ اچانک موبائل رنگ ہوا۔ پرنسپال کی کال تھی۔

”It is an urgent matter“ فوری پہنچو۔

کانفی شش و پنج میں کالج پہنچا۔ الیکٹریک پول پر نظر پڑی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ پرنسپال کے چیمبر میں داخل ہوا۔ جواد صاحب آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ پرنسپال نے مجھے دو کاغذات سوچتے ہوئے کہا۔

”Deal it properly، مجھے تمہاری سرولیس بک چیک کرنی ہے۔“

جواد صاحب انھیں آواز دیتے رہے مگر پرنسپال روم سے نکل گئے۔ میں نے دونوں کاغذات کیے بعد دیگرے دیکھ ڈالے۔ پہلا کاغذ تیش کی ایک ہفتہ کی رخصت تھی جو منظور کر لی گئی تھی۔ دوسرا کاغذ جواد صاحب کا شکایت نامہ تھا جس میں تیش کی برطرفی کا مطالبہ تھا۔

”کیا معاملہ ہے۔“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”اس کی تیش کو فوری ملازمت سے برطرف کر دیں۔ اس نے میری بیٹی کو گورغلا یا

ہے۔“

”آپ کو کیسے پتا“

”خرفانہ نے کال کی تھی کہ وہ خبیث اس کے ساتھ ہے۔ میں پولیس تک جاؤں گا۔“

”کس جگہ ہیں وہ لوگ“

”یہی تو نہیں بتلایا۔ کہتی ہے آٹھ روز میں آئیں گے۔“

”دیکھئے جواد صاحب حالات آپ کے موافق نہیں..... اس میں آپ کی بی

بتلی ہوگی۔“

”پھر میں کیا کروں۔ یا اللہ۔ یہ کیسا عذاب ہے؟“

”پاس پڑوس..... اور کسی کو ظلم ہے؟“

”نہیں۔“

”مجھے غلط نہ سمجھئے“ میری آواز کانپتی ”آپ بھی کچھ دنوں کے لیے ترک مقام کر

لیجئے۔“

”جی مگر.....“

”بعد میں حالات کے مطابق بات بنائی جاسکتی ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا،

اور باہر نکل آیا۔

”میں نے سرولیس بک چیک کر لی ہے اور اسے اپروول کے لیے پریسڈنٹ کے

پاس بھیج رہا ہوں۔“ پرنسپال کی آواز ابھری اور میرے تصور میں سوامی جی کا زرد صاف لہرایا۔

اسکوٹر پر سوار ہوتے ہی میری نظریں خود بہ خود اس طرف اٹھ گئیں۔ مگر اب وہاں

کیا تھا؟ سوائے ایک سخت کھر درے سمٹ کے الیکٹریک پول کے۔ ●●

### اسیر ہندسہ

تعلیمی سازش کا ہتھیار رنگ آلودہ ہو چکا تھا۔

ایک رات، میں، سرزد ہونے والی چوری میں، چپکے سے، اس روٹی سے اٹے کمرہ میں سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے لحاف میں چھوڑ رہا تھا کہ لائٹ آف ہو گئی۔ اندھیرے میں دھواں میرے ساتھ اٹھا۔ میرے قدم ایک دوسرے پاؤں سے ٹکرائے۔ اپنے ذہن میں خفت کا بوجھ لیے میں میٹریکس کے قریب رک گیا تاکہ فیوز کو دیکھ سکوں، سگریٹ کے کش سے ابھرتی ہوئی روشنی میں میں نے دیکھا کہ فیوز کے دونوں تار محفوظ ہیں، فیوز کو پھر سے اندر دباتے ہوئے میری نظریں غیر ارادی طور پر میٹر پر رک سی گئی۔ 469 نظر آیا۔ کہیں دبا ہوا تجسس پیشانی کی شکنوں سے واضح ہوا۔

”ہاں 469 ہی ہے“ میرے منہ سے نکلا۔

وہ 4 ہی ہے جس سے ٹکرا کر میں نے خفت کا بوجھ اٹھایا تھا۔ 6 تو میں ہی ہوں اور 9

..... میں غور کرتا گیا، میں نے باآخرا سے دریافت کیا اور مسکرا دیا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ جلد میری گرفت میں کیوں نہیں آیا تھا۔ ہم دونوں کی وابستگی میں ابھی وہ لمحہ نہیں آیا تھا۔ جب آواز آنکھ سے سنی جاتی ہے اور بصارت کانوں کی محتاج ہوتی ہے۔

”تو وہ 9 ہی ہے، ایک لمحہ کے لیے پیشانی کی شکنیں لبوں پر سفر کر گئیں!“

پھر میرا یہ سفر، ایک دوسری شکل میں 469 کی کوکھ سے شروع ہوا۔ اس سفر کی منزل پر مجھے جو ہندسہ نظر آیا تو چند ثانیوں کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ سارے شہر کا کرنٹ میرے اندر بہ رہا ہے..... اس ہندسہ کی کوکھ سے میں نے 1 کی بازیافت کی۔

”اکائی ہمارا مقدر ہے“ میرے منہ سے نکلا۔

نہیں ہمارا نہیں چوں کہ میں نے سفر کیا ہے اس لیے اکائی میرا مقدر ہے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے ہمارا کہا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے میں نے سوچا ہر آدمی جو ’ہمارا‘ کہتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آبادیوں میں رہتا ہے اگرچہ اس ’ہمارا‘ میں وہ لاشعوری طور پر ’میرے‘ قریب تر ہوتا ہے۔ سالہا سال کی سماجی زندگی..... انگلیوں کے چلنے کے احساس پر، سگریٹ کا ٹکڑا سونے ہوئے کے قریب پڑ گیا۔ نیند کی حالت میں ہی اس نے سگریٹ بجھا دیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ بہت سے لوگ جاگتے ہیں۔ سوتے نہیں تاکہ جاگنے کا عمل پراسرار کر سکیں۔

میں نے اتنا کرنینڈ کرنا چاہی مگر رہ کر یہی خیال سامنے رہتا کہ شاید 9 بھی سونہ رہا ہو؟ پیاس کی شدت لیے میرے پاؤں رسوئی گھر میں داخل ہوئے۔ 9 پانی پی رہا تھا۔ اور میں بھی۔ مگر میرے ہاتھوں کو کسی سخت چیز کے پکڑنے، منہ تک لے جانے کے عمل سے نہیں گزرنا پڑا۔ 9 بھی دیر تک اپنے منہ سے گلاس کو نکائے، مجھے پیاس بجھانے کا موقع دیتا رہا۔

میں نے مناسب جانا کہ کوئی بھی چیز تصور سے پیاس نہیں بجھا سکتی۔ کیوں کہ جہاں کہیں شدت آجاتی ہے تصور دم توڑے عمل کے وجود کو پانے کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ اس لیے قدم اٹھ گئے اور چھن سے گلاس گر جانے کی آواز، ایک لمحہ کے لیے قدیل کی روشنی کو جھللا گئی۔

جب دو نازک لمبے میرے نازک لمبوں سے پیوست ہو گئے تب ہم دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ منزل آتی گئی جب آواز آنکھ سے سنی جاتی ہے اور بصارت کانوں کی محتاج ہوتی ہے۔ وہ شاید گلاب پانی نہیں نہیں۔ اس کی خوش بو، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں سب کے درختوں کے جھنڈ میں مد ہوش آگے بڑھ رہا ہوں۔ دور بہت دور، اچانک اس سفر کو ٹھوکری لگی اور 9 نے کہا تم سگریٹ بہت پیتے ہو،

میں نے جواب دیا ”تم سب بہت کھاتے ہو“ کچھ لمحوں کے لیے 9 کا چہرہ قدیل ہو گیا۔ میں نے لپک کر کسی وحشی ہراساں مسافر کی طرح قدیل اٹھالی قدیل کی روشنی جھللائی رہی اور میری انگلیاں اس روشنی کی آگ میں لذت حاصل کرتی رہیں اور آخر ہم دونوں 15 بن گئے۔

ہم دونوں کو اپنے لباس کی پاکیزگی کا احساس تھا اس لیے فوراً 9 اور 6 ہو کر لباس کی شکنیں درست کرتے رہے اس اثنا میں 9 میرے جسم پر لگے ہوئے ایک بال کو علاحدہ کرتا اسے اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے چل دیا، میں نے گلاس کو سیدھا کیا اور پھر میرے قدم روٹی اسے اٹے کرہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اچانک روشنی آگئی۔

4 جاگ رہا تھا!!

میں لحاف میں، منہ ڈھانپے سوچنے لگا۔ ”شاید 4 نے آج بول کے جنگل کی سیر کی

ہے۔“

ان دنوں میٹر نے 694 کے ہند سے دکھانے شروع کیے۔ مجھے اپنے ہندسہ کی اولیت سے شمار سا ہوتا، شمار ہمیشہ اولیت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور مجھے اپنی اس تخلیق پر خوشی ہوتی لیکن 14 اکھڑا اکھڑا رہتا.....

پھر ایک دن جب میٹر نے 964 کے ہند سے دکھائے میں پریشان اور 4 چونک اٹھا..... اور 4 کی جہلت کی ہوا تند ہوا کرتی ہے جو کچھ وقفوں میں دم توڑ دیتی ہے ان ہواؤں کا حال گرما کے ان جھکڑوں کی طرح ہوتا ہے۔ جو اپنے اطراف گھیری ہوئی چٹانوں کو دیکھ کر اپنی ساری تندی کھو بیٹھتے ہیں مگر 9 کی جہلت کی ہوا ایک خاموش طوفان ہوا کرتی ہے۔ جب یہ طوفان اٹھتا ہے تو تمام چٹانیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ اور ساری دنیا کو علم ہو جاتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔

4 تو اب تک یہی سمجھتا رہا کہ 6 کی 9 سے دلچسپی ایک متوازن جنسی عمل ہے مگر جب 9 کو بھی اس عمل میں سنجیدہ ہوتے دیکھا تو اسے ایک بدنام لفظ سوچا۔ 4 نے اس مصروف زندگی میں قرون وسطیٰ کی مشہور داستانوں کو پینتے ہوئے دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس بدنام لفظ میں سب سے یاس انگیز لمحہ تو وہ ہے جب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہوس تو نہیں؟

میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ اگر لیلیٰ اور شیریں کے بھائی آج زندہ ہوتے، تو کیا وہ بھی اپنی بہنوں کی داستانوں کو پڑھ کر اوروں کی طرح مسرت حاصل کرتے؟ چاقو نہ نکال لیتے.....

4 نے بھی ایسا ہی کیا اور میں نے بھی اس ہتھیار کو صاف کیا جو کا فٹاکم اور کتر تازا زیادہ ہے۔ 4 کی کاٹ میرے کترنے کے عمل سے پھینکی تھی اس لیے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے

جانے کیا طے کر کے 4 نے اپنا ایک افسانہ اس کہنے میں بیٹھ کر سنا یا جس کا نام ہندوستان کی اس ریاست سے ہے جو الجھن سے عبارت ہے۔ ہمارے دوست 7-2-5 حیران تھے کیوں کہ انہیں ہمارے کاٹنے اور کترنے کی کہانی کا علم نہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنی اپنی حیرانی کافی میں ڈال کر پی گئے اور 4 کا افسانہ سنتے رہے۔ افسانہ ختم ہونے پر سب اس کی تعریف کرتے رہے اور میں حیرت کے غار میں منہ کھولے، انہیں اور 4 کو تکتا رہا۔ مجھے افسانے کے بنیادی تقسیم نے پریشان کر دیا تھا۔ کیوں کہ یہ تقسیم اس سماج میں صرف ایک ہی بار جائز طریقہ سے چنپ سکا تھا..... اور اب ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ لیلی اور شیریں کے بھائیوں کی یہ تنہا پوری ہو، 4 کو خود اپنی اس لاشعوری حرکت کا احساس نہ تھا مگر مجھے ہو چکا تھا اس لیے میں حیرت کے غار میں منہ کھولے لٹھیرا تھا، پھر مجھے احساس ہوا کہ غار سے ایک چمکا ڈرنکلی جو 4 سے مشابہ تھی۔ وہ چمکا ڈرنکلی مجھے محسوس ہوا کہ میرے حلق میں راستہ تلاش کر رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر نیچے سڑک پر تھوکتے ہوئے کہا، 'اس افسانہ میں جتنا کرب ہے اتنا منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو کیا ہوگا،' لاشعوری کرب لاشعوری کرب سے کم ہی ہوتے ہیں!!

یہ سنتے ہی 4 کے چہرے پر آسودگی کا چمپکا نمودار ہوا اور یہ دیکھ کر 7 نے کہا: (7 اس شہر میں اجنبی ہے۔) اچھا تو وہی ہے جامع مسجد جو تالاب کے اس پار نظر آ رہی ہے۔ میں سنجیدہ ہو گیا مگر 4 نے ہستے ہوئے کہا، 'نہیں! وہ تو کورٹ ہے۔ مجھے سنجیدہ اس لیے ہونا پڑا تھا کہ 7 ہر گنبد نما چیز کو مسجد سمجھتا تھا اور اس کی مصومیت کا اعتراف کرتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ آج بھی انسان کے ذہن میں مصومیت کا وجود کس طرح باقی ہے ورنہ ہماری یہ زندگی جو Screws سے جکڑی جا چکی ہے کچھ لوگ.....

چرر..... بریک گھٹنے کی آواز پر ہم سب نے نیچے سڑک پر نظریں دوڑائیں۔

کاریں، بسیں، آدمیوں کا شور، کھلے گریباں اور چلتی پھرتی بیساکھیاں نظر آئیں، سر کو جھکتے ہوئے میں نے 7 کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور کہا "بل تمہیں ادا کرنا ہوگا کیوں کہ تم بڑے شاطر ہو۔ وہ بل اٹھائے ہٹنے لگا۔

گھر پہنچا تو میں نے سنا کہ آج 9 کو 4 سے باندھ دیا گیا ہے۔ (یہ وہ افسانہ نگار 4 نہیں تھا بلکہ، افسانہ نگار کی پسند تھا۔)

آخر، اس نے اپنی لاشعوری حرکت سے اپنے آپ کو 9 سے وابستہ کر ہی لیا!!! میں نے میٹر پر نظر دوڑائی 1003 موجود تھا میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ اسی لمحہ 1003 کی کوکھ میں سفر کرتے میں نے 4 کو دریافت کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے میٹر میں زندہ گاڑ دیا گیا ہے اور میرے پورے جسم میں شہر کا سارا کرنٹ بے تحاشہ بہ رہا ہے اور مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اپنے اطراف پھیلے مجبوری کے حصار کو توڑ کر 1003 کے ہندسہ کو پار کر جاؤں۔

تعلیمی سازش کا ہتھیار رنگ آلود ہو چکا تھا۔

اس نئے شہر میں سڑک پار کرتے ہوئے 7 نے مجھے روک لیا "ارے میں تو تمہیں پہچان ہی نہ سکا"، میں نے اس کے لہجہ میں چھپی 9 اور 4 کی کہانی کے طنز کو محسوس کیا پھر اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا:

"یار ایک بات کہوں، برائیاں مانو گے۔"

میں نے سامنے سڑک پر گئی ہوئی No Admission کی تختی کو دیکھتے ہوئے کہا "نہیں!" "یار تمہاری صورت تو جلعے ہوئے تمباکو کے پٹے کی طرح ہو گئی ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اب تم مصوم نہیں رہے کیوں کہ

معصومیت کبھی بھی حقیقت نہیں کہتی، خیر چھوڑو۔ اب تو تمہیں کورٹ جامع مسجد نظر نہیں آتی۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے اسے اپنے نئے مکان تک چلنے کو کہا وہ اثبات میں گردن نہیں ہلا سکا اور میں آگے چل دیا۔ نئے کمرے میں داخل ہوا، رات آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے اور کنوارے بٹن کو آن کر دیا۔ جیسے ہی میٹر میں 1 کا ہندسہ آ گیا میں نے کرنٹ آف کیا اور ایک ایسا سازشی انتظام کیا کہ اس 1 کے ہندسہ کے علاوہ تمام ہندسہ اس میٹر میں اسیری کا درد سہتے رہیں۔ بہت دیر تک میرا سکون میٹر میں ٹھہرا رہا۔ اگرچہ تمام رات میرے کمرے کی لائٹ کھلی رہتی مگر میٹر کے اندر مختلف ہندسہ میری سازش کا شکار ہو چکے تھے اور مجھے سکون مل رہا تھا۔

ایک ماہ کے اختتام پر جب Meter Reader نے میٹر کو دیکھا تو اسے میرا کرب اور سکون نظر نہیں آیا بلکہ 1 کا ہندسہ نظر آیا۔ وہ میرا کرب کیسے دیکھ سکتا تھا؟ آج کے کرب کو ہندسوں نے سمیٹ لیا ہے۔ اس کی غلامانہ رپورٹ کے بعد میرے کمرے سے مرے سکون کا واحد علاج انٹھا دیا گیا اور مجھ پر جرمانہ عائد کیا گیا۔

جرمانہ کی کوکھ سے سفر کرتا جب میں منزل پر پہنچا تو مجھے وہاں 9 کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا جو میری ابدی یاد ہے۔ ●●

### ہندسہ عیب

”68 میل“..... اب تک 19 میل کی سہقت ہم نے کی تھی۔ سامنے سیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹکبوتی چہرہ والے مسافر کا کسی تکرار پر کہنا ”زمین دراصل 6 دن میں بنائی گئی ہے۔“ مجھے بڑھال کر دیتا ہے اور میری آنکھوں سے وہ ہرا بھر منظر اوجھل ہو جاتا ہے جس کو غلاف کی شکل میں اُوڑھ لینے کی آرزو ذہن میں سرسرائی تھی۔ مجھے وہ مسافر، مشتبہ دکھائی دیتا ہے بالکل 4 کی مانند۔ زمین 6 کیسے ہو سکتی ہے؟ ڈرائیور ایک بہ یک آئے ہوئے ٹولے پل کو دیکھ، بس کو کچی سڑک پر موڑ چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ بہت چوکس ہے اور اس کے پیروں نے راستوں کا مفہوم جان لیا ہے۔ اس کا نام..... کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر وہ 5 ہوگا۔ اگر وہ 5 نہ ہوتا تو بس پل بھر میں گر جاتی اور پھر ایک منحوس خبر۔ اتنا تو مجھے معلوم ہی ہے کہ وہ 8 ہی ہوگی۔ اس معلوم کا علم مجھے ان پچھلے ریگ زار لہجوں میں لے جاتا ہے جب میرے لیے کوئی 5

تھا۔ خیر اگر میں فرض بھی کر لوں کہ زمین 6 ہے (اس لمحہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں، صرف میں نے طلق کی ساری رگوں کو چند لمحوں کے لیے نگل لیا ہے) تو ابھی ابھی میں نے 8 کو اس کے ساتھ چپکے ہوئے دیکھا تھا۔ اخبارات جو بس کے حادثہ کو اہمیت دیتے ہیں ایک سیارہ کو بھلا اب تک کیوں کر مشہور نہ کر سکے۔ کیوں اجتماعی راز ہے؟ کیا اجتماعی راز اسے جان لیا ہوتے ہیں کہ ہر ایک اس کو پی لیتا ہے۔ مجھے تو وہ کم بخت مسافر اس زمین پر کسی 5 کے وجود سے بھی مخرف معلوم ہوتا ہے۔ نراجی، کیا وہ اخبارات کو ڈر پوک سمجھتا ہے۔ یعنی بالکل ہی 2۔ ”نرکسی“ میرے منہ سے مادرانہ کف پھنکارتے ہوئے نکلتا ہے اور میں اسے سبق دینے کے لیے چلاتا ہوں۔ ”اے مسٹر.....“ وہ پلٹ پڑتا ہے اور میں سشدرہ جاتا ہوں۔ عجیب چہرہ بن گیا ہے۔ اس چہرہ کی یلغار میں سارے منظر گم ہو چکے ہیں۔ نہ بس، نہ ڈرائیور۔ حتیٰ کہ اپنا وجود بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے یہاں کے ازلی منظر سے ہی وہ چہرہ آسمان کی بلند یوں سے آج تک فضا میں لنگ رہا ہو۔ اپنے حواس درست کرنے کی ذہن میں میرے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے ”اگر بس پل سے گر جاتی تو؟“ اس کے آنکھیں سکیڑتے ہی ازلی منظر غائب ہو جاتا ہے اور وہ بھی ان تمام بے حس چہروں کی طرح 3 بن جاتا ہے۔ جواب دے کر وہ بے تعلقی کے انداز میں پلٹ جاتا ہے۔ ”تو احمقوں کی آرزو، ہر ابھرا خطہ دیکھنے کی خواہش، ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔“

تو کیا اس زمین پر 7 کی آرزو کرنے والے احمق ہیں۔ کیا میں بھی پچھلے ریگ زار لمحوں میں احمق تھا..... 66 میل..... مصروفیات میں گم شدہ ہو جانا ہمیشہ ایک غیر متوقع حادثہ کا باعث بن جاتا ہے۔ کیوں میں نے 67 کو نہیں دیکھا.....

میرے اعصاب باہر کی ہواؤں سے ٹکرا کر نمک کی طرح گھلتے جا رہے ہیں۔ ابھی تو

میں نے 21 میل ہی کی سبقت کی ہے۔ اتنی تھکن..... سورج تو انانیوں کا منبع ہے کانپتے ہوئے ڈوب رہا ہے۔ اس کے لال ریشے زمین پر چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں آسمان پر ایک بہت بڑا لال روشن ہو گیا ہے اور اس لال کی زد میں زمین کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں دو سلاخوں کے درمیان باہر کی پھیلی ہوئی لاصحہ و تھکن کو سمیٹ رہی ہیں۔ جب تک بد صورتی یا خوب صورتی کو کشید نہیں کیا جاتا حسن ان میں عتقا رہتا ہے ورنہ ہم جو عریاں خوب صورتی یا بد صورتی میں حسن دیکھتے ہیں تو محض اس لیے کہ ہماری آنکھ ان کو کشید کر لیتی ہے۔ مگر جب آنکھ میں جالے آجاتے ہیں تو کشیدگی کا عمل رک جاتا ہے اور ہر چیز اپنا حسن کھو کر ایک نامانوس المیہ کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس دور نے مجھے سب سے بڑا کرب، اور کوئی نہیں بلکہ یہی دیا کہ میری آنکھوں میں جالے اتر آئے ہیں۔ میں جو محض شاعر اور سائنس دان نہیں ہوں۔ ایک جو خواب بنتا ہے دوسرا جو اس خواب میں پیہم پتھر پھینک رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر شور پتھر کا وجود باقی رہے مگر اس کی جگہ میرے پیروں کے نیچے ہوا اور جس پر ٹھہر کر میں خواب دیکھوں نہیں بلکہ اسے چکھتا رہوں۔ میں سیدی سادی حقیقتیں چاہتا ہوں۔ کھانا کھاتے ہوئے میں صرف اس کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں نہ کہ اس بارے میں سوچنا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی انسانی ادارے کے بنائے ہوئے وقت کی پابندی کرنا ہے میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے۔ اگر میں کسی آدرش کا احترام کرتا ہوں تو کسی لمحہ اسے ٹھکرا بھی سکتا ہوں۔ میں کسی دوزخ میں گرتے ہوئے کسی جنت کا خیال اور جنت میں داخل ہوتے ہوئے دوزخ کا خیال اپنے اطراف پھیلے ہوئے فلسفوں کی بنا پر محسوس کرنا نہیں چاہتا۔ میں زیادہ تر ایسی آواز پر ہی زیادہ کان رکھنا چاہتا ہوں جو کسی اور کان سے ٹکرانے میں محو نہ ہو بلکہ خود کو سنے۔ وہ نظر جو خود دیکھے



اور وہ احساس جو خود کو محسوس کرے۔ میرا ایتقان ہے کہ میری تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ ہے جو میری فطری سیاحت کو سفیدی اور فطری سفیدی کو سیاہی میں بدل دینے کے جتن میں مجھ کو پھنس رہی ہے۔ میں ایسی ساری حقیقتوں سے جو مجھ پر ٹھوکی جا رہی ہیں شدید نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا نے مجھے خالص مٹی سے بنایا ہے اور اس کی یہ غیر خالص دنیا خدا کی بھول کا انتقام مجھ سے لیے میری تکمیل میں مصروف ہے۔ میں اس لحد کو اب دبی کر دینے کا قائل ہوں، اور انتظار کر رہا ہوں جب انسان کا شعور اور لاشعور ایک ہو جائے۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو شاید اکتاہٹ مجھ پر طاری ہو جائے گی اور اس روئے زمین پر تجسس کا لفظ مٹ جائے گا۔ لیکن جو کرب مجھ پر طاری کیا گیا ہے جس کی وجہ سے میں مٹ رہا ہوں اس کے لیے میں یہ سوچا اپنی تمام تر وحیت اور غیر وحیت سے پکھٹنا چاہتا ہوں۔ باہر قدرتی حسن کے کھوجانے کے لیے میں مجھے اس دور کی سازش کا شہ ہوتا ہے۔ یہ سازش محض خندق نہیں ہے جو زمین سے تحت السمائی تک جاری ہے یا آسمان تک سفر کر رہی ہے بلکہ انسانی ذہن کے بے چین ہونے کا وہ ہتیر ہے جو ہر جگہ غلامیوں بھر رہا ہے۔ پھر بھی بے سکون ہے، مدد اکہیں نہیں ہے۔ قدرتی حسن کے کھوجانے کا ایسا انسانی بے چینی کے مقابلہ میں کتنا مخفی لگتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری آنکھوں میں جو جالے اتر آئے ہیں وہ اس دور کا کرب نہیں، بلکہ حقیقت میں اس کی لا چاری و بے چاری ہے!! کاش ایسے میں 11 بھر سکتا مگر ڈوبا ہوا سورج، جو تو انائیوں کا منبع ہے کیسے ایک بے یک بھر سکتا ہے۔ ان لمحات میں کنڈکٹری وہ جو ابی آواز مجھے دنیا کے سب سے زیادہ سراپہ کر دینے والی آواز محسوس ہوتی ہے۔ اول تو میں اس آواز کا تعلق صور سے جوڑ دیتا ہوں پھر جھجھلا کر سائرن سے ملا دیتا ہوں کیوں کہ صور سے متعلق تو میں جانتا ہوں لیکن سائرن کو تو آئے دن محسوس کرتا ہوں سچائی تو جاننے سے زیادہ محسوس کرنے کے عمل سے باندھی

گئی ہے۔ جب کبھی مجھے سائرن کی آواز خاموش دکھائی دیتی ہے تو میں مسکراتا ہوں۔ مجھے لگتا ہوتا ہے کہ دراصل یہ ہواؤں کی سازش ہے جو ہم کو مطمئن دیکھ کر اچانک اپنی اغوا کردہ سائرن کو آزاد کر دیں گی۔ مطمئن کر کے قتل کرنے کا حربہ تو اب زنگ کھا چکا ہے، ہوائیں اس معاملہ میں انسانی حس کے سامنے اڑ نہیں سکتیں۔ پھر بھی جو لوگ اپنے آپ کو مطمئن دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اس سفر کی طرح ہیں جو ایک طویل مدت بعد خوش آئند تصور لیے لوٹ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ وہاں نے اس کا گھر اجاڑ دیا ہے اور شاید اب کوئی اسے پہچانے بھی نہیں کیوں کہ آوازوں نے ہر چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ سائرن تو ایک وہا ہے جو ہمارے اطراف منڈلا رہی ہے۔

18 سٹیج وہ کنڈکٹری کی آواز تھی۔ اگر وہ جھوٹ موٹ ہی تلی کے لیے 7 کہہ دیتا تو کیا بگڑتا؟..... موت کے لمحوں میں ہم کیوں جھوٹ نہیں بول سکتے ہمکن سے اس جھوٹ سے کئی زندگیاں ہمک پڑی ہوں، مگر نہیں ہم دعا کرتے ہیں۔ ”اے خدا ہمارے گناہ معاف کر“ گویا اس جملے کے لیے ہم موت کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ جب قدرتی موت کے لیے دعا مانگی جاتی ہے تو کیسے موت کے لیے کیوں نہ مانگی جائے۔ آدمی قدرتی موت کا تو ایک ہی وفد شکار ہوتا ہے مگر کیسے موتیں ہر لمحہ اس کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ آج جب کبھی آدمی کیسے موت نہیں مرتا اور اسے چند لمحوں کے لیے سکون مل جاتا ہے، تو دراصل وہی لمحہ اس کی قدرتی موت ہے۔ میری آنکھیں دعائے انداز میں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ ”اے خدا تو بے سکون کی سنتا ہے اور میں تو اس دور میں پیدا ہوا ہوں میری آرزو ہے کہ.....“ آکھ شرمندگی کا احساس لیے جھک جاتی ہے۔ یہ احساس ہاتھ کی وجہ سے ہوتا ہے بھلا خدا سے اس بات کی امید دفعتاً کیوں کر کرنی چاہئے کہ ہم زہر کھا رہے ہوں اور وہ امرت

بن جائے۔ مجھے تو اپنی آرزو ان ہواؤں کو بتا دینا چاہئے جو ہرکان سے نکل رہی ہیں۔

”میں 8 کو مغلوب کرتا، 9 کے سینے پر 5 کا عزم اور ہاتھ میں 1 کی قوت پکڑے تمام 4 اور 2 کو مردہ کرتا، 3 کا چہرہ بدلے 7 کا بیج بودینا چاہتا ہوں“.....

”عبث آباد“ کنڈکڑ کی آواز بیچ میں ابھرتی ہے۔ مسافر چڑھتے ہیں اور مسافر اترتے ہیں۔ دونوں کے چہروں پر مایوسی کا پرتو..... منزل ملنے اور منزل کی تلاش اپنے ساتھ ایک ہی لفظ رکھتی ہے۔ ”عبث“.....

60 میل بس کا پھیرا چھل کر میرے ذہن میں آ گیا ہے۔ سنگینوں سے لیس ایک عفریت نہ جانے کس گوشے سے نکل کر میرے اندر قہقہے لگا رہا ہے اس کی شکل اس مسافر کی طرح ہے جس نے مجھے احق کہا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ اس زمین پر 7 کا بیج بودوں، یہ چاہ اس کی شکل ہے جو مسافر کی ضد ہے مگر اس کے ساتھ عبث دکھائی دیتا ہے۔ فنا کی کک شاید میرے دل میں اس لیے ہے کہ میرے اندر وہ مسافر بھی ہے اور اس کی ضد بھی۔ ہزار ہا شخصیتوں کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوگا کہ میرا وجود بھی ہے۔ آخر میں مکمل اکائی کیوں نہیں ہوں جس دن آدمی مکمل اکائی بن جائے گا۔ شاید اسے اپنے فنا ہونے کی کک نہ ستائے کیوں کہ وہ ہزاروں چیزوں میں مختلف بیج سے سہی مگر اکائی دریافت کر لے گا..... میرا بی چاہا کہ اس حرکت کرتے ہوئے تابوت سے نکل کر اس پتھر کو ریزہ ریزہ کر دوں جس پر ابھی میں نے 60 کندہ دیکھا تھا۔ مگر اس تابوت سے نکل کر کہاں جاسکتا ہوں۔ ہر جگہ تابوت ہیں..... حرکت کرتے ہوئے اور ٹھمد..... ان میں ہم اپنی مسافتیں چھوڑنے اور لینے کا جتن بڑی احتیاط سے کرنے میں غلط ہیں اور ایک طرح کی خوابیدگی میں ہنہنار ہے ہیں کہ ہم کتنے آزاد ہیں۔ حالاں کہ ہم ان تابوتوں میں پڑے ہوئے پتھروں میں کندہ ہیں یہ تابوت جب چاہتے ہیں اپنی

روش سے ہم کو ایک پتھر سے آزاد کرتے ہیں ساتھ ہی دوسرے پتھر میں اسیر کر دیتے ہیں۔ میرا سر سلاخوں میں نڈھال پڑا ہے۔ حرکت کی زد میں آ کر زمین ذرات بکھیرتی جا رہی ہے۔ نیم تاریکی میں مجھے ان ذرات سے ایک ہیوٹی بنا دکھائی دیتا ہے وہ اپنی دھول خوار آنکھیں جھکائے مجھ سے پوچھتا ہے۔ ”تم نے غور کیا کہ زمین کے ساتھ عبث کیوں چپک گیا ہے۔ میں چپ ہی رہتا ہوں وہ سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے۔ ”تم جانتے ہو میں کون ہوں۔“ میں زمین کا ناظر ہوں۔ وہ خود ہی جواب میں کہتا ہے۔ ”تمہیں وہ منظر دکھاؤں کہ اس زمین پر تم نے کس ہندسہ کو کن معنوں میں پایا اور کن معنوں میں کھو دیا..... وہ اپنا حلق کھول دیتا ہے۔ میری آنکھیں اس ٹیلے نر حلق میں گھس جاتی ہیں۔

منظر 1: ایک کہنہ تاثرات رکھنے والا بوڑھا جدید لیباریٹری میں چلا تا ہے۔ ”پاؤڈر تیار ہو گیا۔“..... دیوار میں چھپے ہوئے حکم راں باہر نکلتے ہیں۔ ”شہوت؟“..... بوڑھا جواب دیتا ہے۔ ”زمین کو لاؤ“..... روشن دانوں میں ایسا دہ برق انداز اڑتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں زمین کو اٹھائے داخل ہوتے ہیں۔ بوڑھا زمین کو ٹیوب کی خیف پر رکھ دیتا ہے جس میں پاؤڈر کا مخلول ابل رہا ہے۔ اچانک زمین ٹیوب میں حل ہو جاتی ہے حکم راں چلا اٹھتے ہیں۔ ”طاقت“

منظر 2: ہند کمرے میں ایک فرد کی آواز ابھرتی ہے، تمھاری لائینیں دائمی نہیں ہیں۔ یہاں اس خطہ کا رشتہ زمین سے ابدی ہے۔ نیلے رنگ کی جیکٹ پہنا ہوا آدمی تلملا تا ہے۔ ”ہم یہاں فلسفہ سننے نہیں بلکہ یہ جاننے جمع ہوئے ہیں کہ تمھارے علم میں خطہ کس کا ہے“..... پہلا فرد ہرے رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے آدمی کو دیکھ سوچتا ہے کہ آج سچ ہی کہہ دے مگر اچانک اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرتی ہے۔ وہ ایک لاسے سانپ سے باندا جا رہا ہے۔

باندھنے والا نیلے رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے ہے۔ سانپ کی گردن کو دباتے ہوئے وہ ایک مائع گلاس میں بھر لیتا ہے اور بندھے ہوئے آدمی کے قریب جا کر کہتا ہے۔ ”سچ کا انعام“..... وہ اپنا ذہن جھٹکتا ہے تصویر غائب ہو جاتی ہے۔ دیر بڑھ سوا افراد کی سوالیہ نظر اس کی جانب اٹھی ہوئی ہیں۔ اچانک اس کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ ”وہ خطہ نیلے رنگ کی جیکٹ والے سے وابستہ ہے۔“

منظر 3: ایک آدمی کرسی پر روپیوں سے باندھا گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ ہاتھوں کو جنبش دینے آزاد ہونے کی سعی کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے خواب کاٹے جا رہے ہیں..... پھر ایک طویل وقفہ کے بعد اس کی آنکھوں میں خون کی جگہ طمانیت ابھر آتی ہے۔ ہاتھ نوٹ کو جکڑے ہوئے ہیں۔ کانٹے والے اس کے قریب آتے ہیں۔ ہاتھ کی تیسری انگلی سے اس کی پیشانی پر مارتے ہیں ٹھن کی آواز باہر نکلتی ہے۔

منظر 4: سائبان میں عورت بوئے گئے بچوں کو پانی دے رہی ہے اس کے ہونٹوں پر متا مسکرا رہی ہے۔ اچانک اس کا شوہر آتا ہے اور اس کی اس حرکت پر ڈانٹتا ہے۔ بیوی سمجھاتی ہے پھل آئیں گے۔ شوہر کے چہرے پر پہلے تو خوف پھر ایک ایسی مسکراہٹ ابھرتی ہے جو اصل معاملہ جان لینے کے بعد آتی ہے۔ ”جب تک پھل آئیں گے ہم کھادین جانیں گے۔“

منظر 5: ایک آدمی اپنے بیک سے آلہ نکالتا ہے اور اس کو درخت کے ساتھ چپکا دیتا ہے۔ ایک ہرے رنگ کا مادہ درخت سے نکل کر زمین پر بہ رہا ہے۔ دوسرا آدمی چلاتا ہے۔ ”ارے درخت سوکھ جائے گا۔ یہ تو کلوروفیل ہے جو درخت کے ہر فعل کی نگرانی کرتا ہے وہ تو درخت کا خمیر ہے اور.....“

”بند کرو بکواس، کیا میں زندہ نہیں ہوں۔“ پہلا آدمی جھنجھلاتا ہے..... درخت سوکنے لگتا ہے۔ دوسرے آدمی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پھر پہلا آدمی پاس ہی رکھے ٹب کا ڈھکن کھولتا ہے۔ اس میں بالکل تازہ خون ہے۔ ٹب کو وہ درخت کے بیڑ پر انڈیل دیتا ہے، درخت تو انا ہوتا جا رہا ہے۔ صرف پتے سفید ہو گئے ہیں۔ دوسرے آدمی کو اپنی زندگی یاد آ جاتی ہے اور وہ پہلے آدمی سے التجا آمیز لہجہ میں کہتا ہے ”مجھے بھی اس درخت کی مانند کرو۔“

منظر 6: بھتی ہوئی پر شور مرکز پر اچانک دو آنکھیں گر جاتی ہیں، پھر ہاتھ، پیڑ،

ناک، کان حتیٰ کہ زبان گر جاتی ہے اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگی ہے۔ ”بند کرو یہ حادثے“

منظر 7: ”کیا تمہیں یقین ہے کہ اب بھی اتنے عرصہ بعد امید وہاں ہوگی۔“

ہاں..... روشنی لاک اپ کمرے سے باہر کیسے نکل سکتی ہے۔ کھٹ نقل کھلنے کی آواز.....

پھر کمرے میں بے یک وقت دو آوازیں..... ”تم کہاں ہو“

منظر 8: ایک آدمی بڑبڑا کر بستر سے اٹھتا ہے۔ محبوبہ تشویش سے پوچھتی ہے ”کیا

بچھو ہے۔“ محبوب تشویش بھرے انداز میں جواب دیتا ہے۔ ”مخوس خجریں ہیں۔“

منظر 9: اور وہ انھیں یقین دلا رہا ہے کہ Sea-Cucumber کا مائع نکلنے ہی

وہ تمام حادثوں سے بچے رہیں گے۔ اس مائع کی قیمت وہ طلب کرتا ہے۔ وہ تمام اس کے پاس

قیمت گردی رکھ دیتے ہیں اور مائع نکل جاتے ہیں۔ امتحان کے طور پر وہ ایک آدمی کا گلا کاٹتا

ہے۔ دوسرے ہی لمحہ گلا نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر سینہ توڑتا ہے۔ سینہ بھی دوسرے پل نمودار ہو جا

تا ہے۔ تمام ہنسی خوشی جل دیتے ہیں مگر وہ آدمی جس پر ابھی دو تجربے کیے گئے تھے۔ اپنی روح

پر زخم محسوس کرتا ہے پھر خوش ہو جاتا ہے کہ قیمت ہی کیا تھی محض ”محبت۔“

منظر 10: ایک لامحدود لائی قینچی اپنے دونوں منہ کھولے مسلسل حرکت کر رہی ہے۔

ہر منظر منہ میں سے گذر جاتا ہے اور ڈھیر ہو جاتا ہے مگر دوسرے ہی لمبے اٹھ کر اپنے ہمسائے زخمی منظر سے فہمی خوشی مل رہا ہے۔ تمام منظر اس عظیم حادثے کو بھول کر لالچینی باتیں کرنے میں مگن ہیں۔ ان سب نے سوچ لیا ہے کہ قہقہی ان کا مقدر ہے۔“

حلق بند ہو جاتا ہے۔ ذرات گم ہو جاتے ہیں اور میری آنکھ اس دروازہ کو لیے First Aid Box پر رک جاتی ہے۔ بس خالی ہو چکی ہے صرف میں اور وہ مسافر گم سم ہیں۔ وہ مسافر آہستہ سے اپنی سیٹ سے اٹھتا ہے میری اجازت سے میرے بازو بیٹھ جاتا ہے۔ 8 میل..... سر سے کوئی چیز گردش کرتی ہوئی آنکھوں کے راستے باہر نکلنے کی سعی کرتی ہے۔ میں اسے روکنے کے لیے مسافر سے پوچھتا ہوں، ”آپ کا نام۔“ مسافر کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے ہیں جیسے میں نے کوئی غیر متوقع اور غیر متعلق سوال کیا ہو۔ پھر وہ جذبات سے عاری لہجہ میں جواب دیتا ہے۔ ”ہم سب 8 ہیں۔“ ہمارا اب کوئی نام نہیں..... باہر چاندنی پھیل چکی ہے۔ مجھے ایک طرح سے یہ چاندنی غازہ دکھائی دیتی ہے جو زمین کے مسخ چہرے کو چھپانے کے لیے تھوپی گئی ہے۔ بس کو بریک لگ جاتی ہے اور مسافر بے چینی سے باہر نظر ڈالتا ہے۔ دو انسپکٹر داخل ہوتے ہیں اور مسافر کی تلاشی لینے لگتے ہیں، پھر میرے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا گیا ہے جب میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی جاتی ہے تو میں کھڑکی سے نظریں ہٹائے چومک جاتا ہوں..... انسپکٹر کی آواز ابھرتی ہے ”وہ چیز مل گئی“

جیب نہ جانے مجھے کہاں لیے جارہی ہے۔ میں اتنا حیراں ہوں کہ اس طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے پچھلے ریگ زار لٹھوں میں خود کو تلاش کر رہا ہوں۔ ہاں میں 6 ہوں۔ 9 جو وہ تھی۔ 4 وہ تھا 3 جو وہ سب تھے ان دنوں جب مجھے چاندنی غازہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے اور 9 نے بہ ظاہر ہوئی اور بہ باطن اکائی کے اس جذبہ کو 7 کی اساس پر 1 کی قوت کے

ساتھ اپنے اندر سمولیا ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارا کوئی 5 نہیں ہے پھر بھی رفتار میں کمی نہیں ہوئی، اس رفتار کی راہ پر ہم لالچینی حرکتیں کرتے تھے اور بے تکلی باتیں۔ سچ ہے کوئی عرفان لالچینی حرکتوں اور بے تکلی باتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

ایک دن ان سبھوں نے 2 کو ہم پر مسلط کرنا چاہا مگر رفتار بڑھتی گئی۔ جب رفتار بڑھتی ہے تو آدمی کی آنکھیں عموماً زمین پر کم ہی رہتی ہیں۔ پھر اگر ساتھ میں کسی 9 کا وجود ہو تو اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس نفسیات کو سبھوں نے محسوس کیا اور چپکے سے پل توڑ دیا۔ رفتار پل میں مسکتی رہی اور 8 منہ کھولے اس ٹوٹے پل میں اپنے انتظار کو ختم کر چکا تھا..... جیب کے دھچکے مجھے پچھلے ریگ زار لٹھوں سے نکال لاتے ہیں..... غازہ اتر چکا ہے۔ مجھے اب بھی اس بات کا قطع علم نہیں ہے کہ آخر میری جیب سے وہ کون سی چیز برآمد ہوئی جس کی بنا پر مجھے قیدی بنایا گیا ہے، مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ صرف 60 کا ہندسہ میرے اندر سے نکل کر اس زمین پر پکھرتا جا رہا ہے۔ ●●

## مفلوج

(خورشید وحید کی یاد میں)

”یہ کیوں کر اور کیسے ہوا۔“ اس سارے عرصہ میں استاد سعادت علی کا سراپا ابھرتا ڈوبتا ڈولتا رہا تھا۔ گئی رات جب میں شہر کے پر شور لغروں سے خلاصی پا کر اپنی چھت پر پہنچا تو نسبتاً ملول اور واقعتاً افسردہ تھا۔ اماں نے خلاف توقع آج ہی چھت پر سونے سے منع کیا تھا ورنہ وہ ہر بار شبانہ کے منع کرنے پر میری حمایت کرتی آئی تھیں۔ میں ہمیشہ سے موسم گرما میں چھت پر سونے کا عادی رہا ہوں۔ کھلے میں وسیع و عریض لاکھوں تاروں سے بھرے آسمان کو تکتے ہوئے، اپنے آپ کے حقیر ہونے کی لذت کا احساس مجھ پر مدہوشی طاری کر دیتا ہے۔ مگر گذشتہ ایک دہے سے اس شہر پر جولائی اگست کے مہینوں میں زلزلے کے ہلکے سے جھٹکے محسوس کئے جا رہے تھے۔ اس لئے شبانہ اور بچے بالخصوص جمال میرے چھت پر سونے کو میری ہٹ

دھری پر محمول کر رہے تھے۔

”میں نے کب اپنی من مانی کی ہے۔“ کرسی کے ہتھے پر مجھے اپنے ہاتھوں کی کچھلی محسوس ہوئی۔ آنگن میں تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کے جھماکے اشوک کے پتوں پر تیز دار کر رہے تھے۔

”میں تمہارا داخلہ اگر کلچر میں کرنا چاہتا تھا مگر تم نے سول انجینئرنگ میں میری مرضی کے خلاف ایڈمیشن لیا تو کیا میں نے اپنی چلائی۔ جواب دو جمال“ میں نے لرزتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ وہ آنکھیں جھکائے واشنگ مشین پر اپنی شہادت کی انگلی کرید رہا تھا۔ اماں اور شبانہ اسے ایک ٹک گھور رہی تھیں۔

”میں ناظمہ کے انگریزی میڈیم اسکول میں داخلہ کے خلاف تھا۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ نسرین خیر البانات مدرسہ کے ہوٹل میں شریک ہو کر عالمہ کورس کی تکمیل کرے۔ مگر تم لوگوں نے کب میری چلنے دی؟“ میری آواز روہانسی ہو گئی۔

”اب بس بھی کرکمال“ اماں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

چھت پر پانی کی ٹنکی سے متصل سائے میں میرا بستر لگا دیا گیا تھا۔ آسمان میں نیم اندھا چاند اپنی چاندنی کا سیلاب شہر پر انڈیل رہا تھا۔ گذشتہ ایک ہفتہ سے جاری مناظرہ کی آوازیں مدہم ہو چکی تھیں۔ شہر کے لوگ اپنی اپنی گلیوں میں اس مناظرہ پر تبصروں میں مشغول نظر آتے تھے۔ ایک گروہ ’شرع‘ کی تلقین میں لگا تھا تو دوسرا گروہ ’طریق‘ کو اصل مقصد حیات قرار دینے پر بے ضد تھا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے ’مرکز‘ سے ہٹ جانے کا شگورہ کر رہے تھے۔ چھت ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا غالباً وہ دونوں گروہ سلاخوں سے لیس اپنے اپنے محسوس میں محفوظ ہیں۔

ڈرائنگ ہال کی چوکور سلاخ دار کھڑکی میں انسانی سر کے سایے نے مجھے اسٹڈی روم میں کتاب چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں جان گیا تھا کہ تمنا سلطانی کھڑکی میں آئی ہے۔ گھر میں اس وقت میں تھا تھا۔ اماں نے بچے اور شہانہ اپنی والدہ کی خبر گیری کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان کا مکان کچا تھا۔ شہر میں تاریخ میں پہلی بار گزشتہ شب کے آخری پہر زلزلہ کا ہکا بھکا محسوس کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ میں کرسی سے اٹھا۔ اپنے نوٹس کی تیاری کر چکا تھا۔ ڈرائنگ ہال میں بے نیازی کا پوز کرنا ہوا داخل ہوا۔

’سر! اشتعال پیدا کرنے والی آواز تمنا کی تھی۔ میں نے چوتکتے ہوئے چوکور کھڑکی کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ سورج کی روشنی کا انعکاس اب بدن پر تھا۔

’سر۔ یہ زلزلے کیوں آتے ہیں۔‘ وہ تشویش زدہ تھی۔

’زمین کے اندر ہی اندر بہت زیادہ گہرائی میں فوج کا حملہ ہوتا ہے‘ مجھے اپنی علمیت کا رعب جمانے کے لیے کوئی اور جواب نہیں سوچا۔ میں نے اس کی بولتی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ’ہاں زمین کو بھی فوج ہوتا ہے۔‘

’مگر کیسے‘ اس نے پھر تشویش سے پوچھا۔

میں نے اور قریب ہوتے ہوئے اپنا بدن دیوار سے ٹکادیا اور ایک نیم بوسہ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں پر رکھ دیا۔ اس کے پونے تھر تھر رہے تھے اور میرے دونوں ہاتھوں کی تین کپکپاتی انگلیاں اس کے مرتعش سینہ میں دھنستی جا رہی تھیں۔

’ایسے‘ میں نے دیوار سے پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا۔

’ذرا اور وضاحت سے سمجھائیے‘ تمنا کی آواز زندہ گئی تھی۔

’دیکھو جب زمین کے اندر ہی اندر کسی ایک نقطے پر فاسد مادوں کا اجتماع ہو جاتا

ہے تب زمین ہی کا کوئی ایک متاثرہ مرکز، ان فاسد مادوں کو پوری شدت سے آگے ڈھکیں دیتا ہے جس کے باعث زمین میں کپکپاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہی زلزلہ ہے۔ اس عمل میں شدت جتنی زیادہ ہوگی زلزلہ اسی مناسبت سے واقع ہوگا اور زلزلے کا تخم جانا زمین کا مرکزی حصہ مفلوج ہو جاتا ہے۔‘ میں نے نیم غنودہ پوریت سے جواب دیا۔

پانی کی ٹنکی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے نیم غنودہ شہر پر نظریں دوڑاتے ہوئے آفت کے اس پار کچھ کھوجنے کی کوشش کی مگر دور تک اونچی اونچی گنبدوں اور درختوں کے جھنڈ کے سوا کچھ اور بھائی نہیں دیا۔ تھک ہار کر میری نظریں خود بخود پڑوس کے نیم روشن آنگن پر جم گئیں۔ مگر اب وہاں کیا تھا۔ تمنا کی رخصتی کو قریب ایک ماہ گزر گیا تھا..... اس عرصے میں وہ کبھی دکھائی نہیں دی۔ بستر پر نیم وا آنکھوں سے آسمان تکتے ہوئے مجھے خیال گذرا کہ ان دنوں مجھے روحانی محبت کتنی فضول اور بے معنی لگتی تھی.....

’فوج اندر ہی اندر پلٹا رہتا ہے۔ وہ ہر شے میں سرایت کرتا ہے۔‘

’کس نے کہا؟‘ آنکھ ملنے ہوئے میں نے دیکھا۔ اب بھی مناسب اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ فضا میں ہلکی سی خشکی تھی۔ فجر کا وقت نکل چکا تھا۔ صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ہلکی سی پڑمردگی تھی۔ گناہوں کی لذت سے تہی عبادت میں کس قدر بے کفنی ہوتی ہے۔ میں اٹھا۔ بستر سے تھوڑے فاصلے پر حسب عادت اور ہدایت پانی کا لوٹا اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ پانی پر پانچ مرتبہ درود دم کیا اور پھونک ماری۔ مطالعہ نے کہا۔ قرآن سے پہلے درود کا ورد کیوں کیا؟ میرے پاس اس کا کوئی دل لگتا جواب نہ تھا۔ پھر میں نے حسب یقین قرآن کی ایک سورت پڑھی جس میں آدمی کو سب سے افضل تخلیق ہونے کی بشارت دی گئی ہے پڑھی، اور پانی پر پھونک ماری۔ مطالعہ نے کہا: اب یہ شاقی عمل ہے۔ میرے دل کو اطمینان ہوا۔ پانی پیتے ہوئے میں نے

سارے وجود کو شہرِ ایلور محسوس کیا۔ یہ آبِ شفا ہے۔ دورِ مسجد کے میناروں پر بے ریا روشنی جمی ہوئی تھی اور بارن کی آوازوں پر لگا شہر جاگ رہا ہے۔ بیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے نئی پھاٹک کھولا اور دالان میں پاؤں رکھے۔ اماں اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئیں۔ ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں ایک ان جانے خوف کا احساس جاگا۔ آگے بڑھ کر میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”اماں جان بس آپ مجھے معاف کیجیے۔“

میرے سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انھوں نے کہا ”ایسا کیوں کہتے ہو میرے

بچے۔ روزِ روز“

میں کیا جواب دیتا مگر میں کہتا چاہتا تھا: ”ماں میں ہر محاذ پر ناکام ہوا ہوں کیوں کہ میں کسی معاملہ میں ایمان دار نہیں رہا۔ میں نہ دنیا کا وفادار رہا نہ ہی عاقبت سے بہرہ ور ہوا۔“ میں کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ کسمساتا ہوا اٹھا اور ڈرائنگ ہال میں داخل ہوا۔ چوکور کھڑکی پر نظر اٹھی۔ قریب ہی جمال بے سدھ سویا ہوا تھا۔ شاید وہ رات دیر گئے شرع کے اجتماع سے واپس لوٹا تھا۔ میں نے اس کی رضائی ٹھیک کی۔ اپنی بے وطن بیٹی کے لیے ایک ہوک سی اٹھی اور اپنی ہم وطن بیٹی کو یاد کیا۔ حالانکہ دونوں کی شادیوں کے بعد کس قدر فراغت کا احساس ہوا تھا ”آخر یہ لڑکیاں ہمیشہ کے لیے کیوں جدا ہو جاتی ہیں۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”یہ ہم دردی کے پردے میں کون سا نیا پینتیرہ سوچا ہے“ شبانہ نے اسٹڈی روم سے نکلنے ہوئے جواب دیا۔

”اے بے عقل عورت میں اپنی بیٹیوں کی بات کر رہا ہوں۔ تمہاری نہیں۔“

”کیا؟“ شبانہ نے تشیح مجھ سے انداز سے پوچھا ”کیا نسرین یا ناظمہ کو کچھ ہوا ہے؟ آپ اس

قدر سنگ دل کیوں ہیں۔ کیوں نہیں بتایا۔ مجھے جگا گیا ہوتا..... وہ روہا نسی ہو گئی۔

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بس ان کی یاد آگئی اور یادوں پر کس کا بس ہے؟“

”مگر یہ تو آپ کے بس میں ہے کہ جلد گھر لوٹیں۔ کس مناظرہ میں گئے تھے؟“

”مجھے کسی مناظرہ کی کوئی حاجت ہے نہ اس سے دل چسپی“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔ آپ کی دلچسپی تو اس جھکی.....“

”شبانہ“ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا ”تمنا اور انعام کے موقف الگ الگ ہیں“

”کیا مطلب؟“ اس نے درشنی دکھائی۔

”مطلب..... کہ..... یوں سمجھو دو کنگن!!“

”اب یہ کنگن کہاں سے آئے“

”یہ وہ کنگن ہیں جس کی امید میں ہر آدمی جی رہا ہے۔“

”آدمی یا عورت!!“ بیوی نے تسخیر بھرے انداز میں کہا

”میں تمہارے کنگنوں کی نہیں ان کا تھو دینے بغیر نہیں مروں گا اور اگر مر بھی گیا تو یہ

تمہیں مل جائیں گے.....“ شبانہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے

میں نے سلسلہ جاری رکھا ”جمال سے اپنی وصیت کا اظہار کر دیا ہے۔“

”پھر کون سے کنگن؟“ شبانہ کے لہجہ میں تشویش تھی

”تمنا اور انعام کا اپنا اپنا موقف ہے“

”یہ آخر ہیں کون؟“

”تمنا سے تم واقف نہیں ہو اور انعام سے میری واقفیت نہیں“

”اب شروع ہو گیا جھکی پن..... کہیں جانا ہے“

گئیں۔

”دنیا اور عاقبت تو دو کنگن ہیں“ انہوں نے گاد تکیہ سے ٹیک لگاتے ہوئے مجھے

جواب دیا۔

”مگر یہ تو ہر آدمی کا مقدر ہے قبلہ“

”لیکن تمنا اور انعام ہر کسی کا مقدر نہیں“ اُن کے لہجہ میں استہزا تھا۔

”پھر میرا مقدر کیا ہے“

”صرف سا لک ہی انعام کا حق دار ہے“ انہوں نے میرا سوال اُن سنا کر دیا۔

”ہمیں کیسے معلوم ہو کہہ.....“

”خاموش..... تو ابھی تمنا میں ہے“

میں نے نکھیوں سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب اماں کے ساتھ مشغول تھی۔

کھڑکیوں سے دھیمی روشنی سرک رہی تھی۔ جمال ابھی تک سویا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی

ضروری کام نپٹائے..... لباس تبدیل کیا۔ آج تعطیل بھی تھی، دلہیز کے قریب میں نے

شبانہ کو آواز دی۔

”دیکھو ذرا اماں کا خیال رکھنا“ میں نے رک رک کر کہا۔

”کیوں میری خدمت میں کوئی کمی دیکھی ہے؟“

”نہیں“

”کیا اماں نے آپ سے کوئی شکایت کی ہے؟“

”وہ کیوں بھلا تمہاری شکایت کرنے لگیں۔“

”عقل مند بیٹے کی ہوشیار ماں ہیں نا وہ.....“

”ہاں مگر جانے سے پہلے تمہیں یہ بات بتانا چاہتا ہوں“

”کون سی“

”یہ کیوں کر اور کیسے ہوا“

”کیا ہوا“

”دراصل.....“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا ”کل رات استاد سعادت علی پر

فالج کا شدید حملہ ہوا ہے۔ اسی لیے رات آنے میں تاخیر ہوئی۔“ میں نے اسٹڈی جاتے ہوئے کن انگلیوں سے جمال کی طرف دیکھا۔

”اب کہاں گئی اس جھٹکی کی حکمت“ شبانہ نے تقریباً تہہ بہ لگاتے ہوئے اسٹڈی روم

میں داخل ہو کر کہا ”اپنی اماں کا علاج کراتے ہیں نا آپ اُس سے..... جو خود فالج سے بچ نہیں سکا..... کاہے کا حکیم اور کاہے کا مرشد؟ اللہ کی جانب سے اچھا انعام ملا ہے

اے“

”انعام؟“ میں چونکتے ہوئے بڑبڑایا۔

”ہاں انعام“ شبانہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا ”میری امی کہتی ہیں کہ اس جھٹکی نے

اپنی بوڑھی حواس باختہ ماں کو آخری دنوں میں بہت ستایا تھا۔“

”بکواس ہے، میری آواز میں خوف کی لرزش تھی۔“

”امی کہتی ہیں کہ اس نے اپنی خلافت نشینی کی محفل میں رات جب اس کی بوڑھی ماں

اپنے گھر میں چراغاں دیکھ کر محفل میں آئیں تو اس جھٹکی نے ان کو خوب جھڑکیاں دیں اور بھری

محفل سے انہیں گھینٹا ہوا اندر لے گیا“ شبانہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

میں کچھ جواب نہیں دے سکا۔ اس رات کی ساری باتیں میری نظروں میں گھوم



”دیکھو..... تم کو شاید ان کی ضرورت نہ ہو مگر میرے لیے.....“

”مجھے بھی اپنی عاقبت کا خیال ہے۔“

”انہیں بادام کا حریرہ دے دینا۔“

”دے چکی ہوں..... اور کچھ.....“

میں باہر نکل آیا۔ بازار میں روزہی کی طرح ’مرکز‘ کی بازیافت اور اس کی تعمیر پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں سب سے نظریں جراتے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”جناب کمال صاحب.....“

”جی“ میں رک گیا۔

”کیا قبلہ کے درشن کے لیے جا رہے ہیں‘ احتشام کے لبوں پر طعنے مسکراہٹ تھی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ پدربندار والد بزرگوار کو یہ غرض آزمودہ علاج راجہ پور کے پھل مندر کے بیماری کے ہاں گیر و چٹانے کے لیے جایا جا رہا ہے“ لفظوں کو چباتے ہوئے اس نے آنکھیں گھمائیں۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ایک طویل تہتہ میرا پیچھا کرتا رہا۔ سعادت منزل کے صحن میں نیم کے پتے مکھڑے ہوئے تھے۔ ارادت علی سامان باندھنے میں لگا تھا۔ اس نے انگلیوں کو جھٹکتے ہوئے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں اندر کرہ میں داخل ہوا اور ٹھٹک گیا۔ استاد سعادت علی شاہ ایک ہی رات میں مجھ سے گئے تھے۔ جسم کا باہاں حصہ پوری طرح مفلوج ہو چکا تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر کچھ بات کرنے کی کوشش کی مگر کنت اور بے زبانی ان پر مسلط ہو چکی تھی۔ وہ زبان جس سے معرفت کے چشمے ایلنے تھے آج خشک ہو گئی تھی۔ وہ بار بار اپنی

کلائیوں میں کچھ کھونچنے کی کوشش کر رہے تھے.....

”یہ کیا انعام ہے؟“ یہ سوال میرے ذہن پر مستولی تھا..... روانگی تک میں رکا رہا۔ پتہ نہیں کب تک.....

شام، شہر کے مرکزی چوراہے پر دنیا اور عاقبت کو گشت لگاتے دیکھ کر میں گھر کی طرف لوٹا۔ پچانک کھول کر گھر کے اندر خاموشی سے داخل ہوا۔ جمال کی زور زور سے چیخنے کی آواز آ رہی تھی..... اسٹڈی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے چوکور کھڑکی میں کسی سائے کے سرکنے کا احساس ہوا۔ میں اپنے آپ کو پلنگ پر ڈھیر کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ جمال ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

”ابا آپ اسے میری گستاخی نہ خیال کریں مگر یہ میری شرعی ذمہ داری بنتی ہے کہ میں آپ کو آپ کے مسلک کی گم رہی کے بارے میں بتا دوں۔ خدا کے لیے..... اچانک جمال لڑکھڑایا میں نے جمال کے وجود کو تھاما..... اس کا دایاں حصہ پوری طرح اکڑ گیا تھا۔ اسے پلنگ پر لٹاتے ہوئے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”اماں“۔ شانہ اور اماں گھبراتی لڑکھڑاتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ جمال کی آنکھوں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ ●●

### تقیہ بردار

گویا سورج طلوع ہو رہا ہے کہ غروب لیکن بانس کا یہ طویل، بے کراں، پراسرار گھنا جھگل بشارت کے عین عین تھا اور انہوں نے کہا تھا: سانس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ ایک انتہائی خفیف سا وقفہ ہوتا ہے، یہ جیس ہے۔ یہیں لا ہے۔ یہیں عدم ہے، اسی کا نام وجود ہے اور یہی کلیم انکشاف اسرار ذات ہے۔

مگر اس کا یہاں پہنچ جانا حکم تھا کہ بشارت یا محض واہمہ!

گہرے سبزی مائل فنکس زدہ پانی میں بانس کا لانا ڈنڈا بکھورے لے رہا تھا۔ یقیناً یہ باؤلی بہت قدیم ہے۔ میں نے بہت بہت پہلے سن رکھا تھا کہ شب شہید اعظم ایک روشن تعزیر یہ باؤلی کی تہ سے ابھرتا ہے اور غالباً تاریک آب اور میلی کانی کو پھاڑتے ہوئے اس بانس میں حلقوم ہو جاتا ہے..... یہ روایتی واہمہ آج بھی میرے لیے محرکیز ہے۔ گو اس کا مشاہدہ

کاروبار حواہش نے کرنے نہیں دیا۔

رضوان کو بھی نہیں گھر لینا تھا؟

اب بھی سارے کا سارا ماحول کبر آلود تھا۔ بار امانت سے ملحقہ پہاڑ، ازلی گواہان تسبیح خواں پتیل کے درخت..... سب کے سب دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ویسے سردی ہو یا بارش سحر گزیدہ ہوں..... اسی رات رضوان نے رخصت ہوتے ہوئے پھر سے اسی وقت وہاں چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ ارادہ موسم سے بے نیاز ہے..... یوں بھی اس رات تعلیم گاہ میں کچھ زیادہ ہی سلوک نوشی رہی تھی، کمرے میں کوئی بلب تو تھا نہیں اس لیے تھر تھراتے چراغوں کی لوؤں اور منتشر مراحمی دھوئیں میں چہرے، باتیں اور شاید منزیں گمان ہی گمان تھیں۔

”اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے اپنے آپ میں نہ رہو۔“

میں نے ظاہر علی شاہ کو تب غور سے دیکھا، وہ اپنے آپ میں نہ تھے۔

باہر کی تنگ و تیرہ ہواؤں کو تنہا تنگ چوکور کھڑکی روکے ہوئے تھی۔ میں ہلکے ہلکے نرم ذائقوں کا دارفتہ، طویل طویل نشتوں کا رسیا اور غم گزیدہ آوازوں کا شائق رہا ہوں مگر یہاں تعلیم گاہ میں..... کبھی جانے کتنے اطمینان کے ساتھ تلخ ترین ذائقہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”لے کر تو بہت دنوں تک سوتا رہا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ گردش مدام بیالہ میں چراغ کی لوئیں لپٹی ہوئی ہیں اور نیم اندھیرے کے پیچھے تمام سرخ آنکھیں مجھو جھبی کو گھور رہی ہیں۔ رضوان کے ٹھوکے پر میں نے بہ دقت تمام چسکی لی۔ تلخ ترین ذائقہ کے ساتھ دور کہیں ڈھول کی آواز کا گمان ہوا.....

جنگل۔

”تو جہاں جنگل نہیں وہاں عشق عدم ہے۔ معشوق اپنی زلف کھولے، دردندوں سے بے نیاز عاشق کے وجود سے منکر کہ وہ خود ہی عاشق ہے۔ عشق کے سائے میں سوتا ہے کہ یہی اصل بیداری ہے۔ راہی، تو جو عاشق ہے، تو جو دردندوں سے خوف زدہ ہے کہ تجھ پر جنگل، اصل حقیقت ہے، معشوق کی جانب گامزن ہو۔“

چلم سے نکلتا ہوا دھواں، تعلیم گاہ کے جاریہ سبق کا ابتدا یہ تھا۔

..... ختم..... تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ تم کو یاد ہے..... کہ یہ آگ کب سلگی تھی۔ مگر..... مگر تم تو مجھ سے منکر اور دردندوں سے بے نیاز ہو۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے چوں کہ میں اپنے آپ کا منکر اور دردندوں سے بے نیاز نہیں ہوں کہ اس قسم کے وقوعہ میں یہ ظاہر کوئی اسرار نہیں ہوتا۔ الوداع ہوتی ہوئی سرد ترین صبح، ٹرین کی بے جان، سیاہ سخت کھڑکی سے تمہارا لنگن میرے ہاتھوں سے شاید اس لیے گر گیا تھا کہ ہر ابتداء اپنے خاتمہ کی اولین گواہ ہوتی ہے۔ خیالات خشوع و خضوع کے حصار کو توڑتے رہے تھے۔

مگر یہاں میری آواز سننے والا کون تھا؟

لاسنے لاسنے موٹے پتھر۔ پلے ستون، جن پر لاکھوں آوازیں لپٹی ہوئی ہیں مگر کوئی آواز نہیروں نہیں ہوتی۔

دور بہت دور، مسجد کے اونچے مینار سے اللہ اکبر کی آواز خفیف سی ہوتی جا رہی تھی۔ اطراف گھنے پے کراں لاسنے لاسنے درختوں کی حد بندی کے بیچ، ایک ٹوٹی ہوئی باولی کے چوڑے پر میری سانسیں پھول رہی تھیں، اس وحشت زدگی میں کہاں نکل آیا تھا۔ خواب پر کس کا بس ہے۔ لیکن کونوں، کھدروں، شیشے کی دیواروں اور کتابوں کی الماریوں میں چھپے منتظر

بیدار نقوش مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ تب مجھ پر سراسیمہ کر دینے والی وحشت طاری ہو گئی..... بھاگتا..... یہاں آپہنچا۔

”بیٹے! سانس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ بیٹے والے نفوس ذات اصغر ہیں۔ تم نے آج اپنے گناہوں اور لاعلمی کو چرانے کا تجربہ کیا ہے۔ اٹھو اور اس خفیف سے وقفہ کی طرف گامزن ہو جاؤ جہاں جس ہے۔“

پلٹا تو سنگھی کرتی انگلیاں غائب ہو چکی تھیں۔ میرا یہاں آجانا حکم تھا کہ بشارت یا محض واہمہ، باولی پر جھکا تو میری وحشت زدگی کے آئینہ میں ایک نیا چہرہ ابھر رہا تھا۔ صاف شفاف پانی کا دیرانہ.....

سانے، ہلکا سبزی مائل پانی حوض میں ساکت تھا، آدی رخصت ہو چکے تھے اور منڈیروں پر چوکنا کوسے کائیں کائیں کر رہے تھے۔

مہمان!

ساکت پانی میں انجیر کا سوکھا پتلا گراتو مجھے خیال آیا کہ متوقع دیدار کی کہانی میں شامل ہونے کے لیے باآخروسورج نیا پیام لیے آیا ہے۔ مجبور سورج، مجبور دنیا اور مجبور آدمی پر طلوع ہوتا ہوا۔

”چلتا ہی چاہئے..... راہی!“

خ:ون:ی:ل:ا:و:ہ

یہ کوئی محلہ ہے یا جنگل؟ بندروں، لومڑیوں، رینجیوں اور بیلوں کے ریوڑ سے پچتا پچاتا اشارہ گاہ تک پہنچا۔ سانے دروازہ پر سورج کی زرد کرنوں میں سفید زنجیر سے بندھا کالا کتا، استقبالیہ مسکراہٹ لیے، دردندوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

”تو کیا میں بھی؟“ ایک سنسنی خیز تیسری اداسی پر غالب ہوتا ہوا محسوس ہوا۔  
”مرشد! کتا، بتیل کا تعاقب کیوں کرتا ہے۔“ تیسرے حکایت جاریہ کا لازمی عنصر تھا۔  
رضوان نے سوچا اور سوال کیا۔

”پردہ!“

”فہم نے مجھے چکا چوندا کیا ہے اس لیے تنگی کا محتاج ہوں۔“ رضوان کے لہجے میں مزید استفسار تھا..... مولوی ذکا اللہ نے اس بار جلم پینے سے بھی انکار کیا۔ ظاہر علی شاہ نے انہیں گھور کر دیکھا۔ چوکور کھڑکی سے چاندنی کی کرنیں تعلیم گاہ کے وسط تک چلی آئی تھیں۔ کالے رومال سے اپنے چہرے کا گمانی پوسینڈ پونچھے ہوئے مولوی ذکا اللہ نے رضوان کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔

”حقیقت کے باب میں، کسان کے پاس اس کے اپنے بیج ہیں اور اس سے ملحق اس کی اپنی زمین۔ بیج بہ باطن تین پودا ہے اور پودا تین بہ باطن بیج ہے۔ سفر کے باب میں کسان اپنے بیج اور خود پر مشتبہ ہوا، اور شبہ تین اٹلیں ہے۔ سن لو کہ اٹلیں صرف جگہیں بدلتا ہے سواں نے سواری بدلی۔ اب کسان کی جگہ، بتیل کی پشت پر وہ سوار ہے اور نادان کسان کہن آلود زمین پر اپنا بتیل سے کھینچتا ہے اور نہیں جانتا کہ فصل کے اس پار عدم مسکراتا ہے۔“

”اور کتا“..... میں نے پوچھا۔

”کتا تین باطن بتیل ہے کہ دم سے خارج ہوتے ہوئے اشاروں پر وارفتہ ہے اور تعاقب اس کا مقدر ہے گویا بتیل غل ہے آدمی کا کہ اسے سبھی، اس کی ازل سے ابد تک جاری رہنے والی عظیم الشان جدوجہد کا نام دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جدوجہد آدمی کے لیے نہیں کتے کے لیے ہے اور کتا گلیوں سے نکلتا ہے تو بازاروں کا تعاقب کرتا ہوا درباروں پر قابض

ہونے کا متنی ہے کہ یہ بھی اس کا مقدر ہے..... افسوس، وجود کی سلی سلوک عدم بے حقیقت ہے۔“

”شاہ..... صاحب.....!“ رضوان نے مجھے ٹھوکا دیا۔ مگر میں اب پوری طرح اپنے آپ میں تھا۔

”تو کتا موصوف ہے کہ وصف“

ظاہر علی شاہ نے کش لے کر اب کی بار رضوان کی جانب ہلیم بڑھاتے ہوئے کمرہ میں پھیلی دھونیں کی چادر کے اس پار ہم سب کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”وجود کے ماسواہر شے وصف ہے اور بتیل غل نہیں، پردہ ہے وجود کا۔“

”پردہ!“

..... میں نے مرغیوں اور بلیوں کی پرواہ نہیں کی اور انہیں ہٹاتا ہوا دروازہ کے اندر داخل ہوا ہا ہر دستخطی رسمیات کے بعد درندے ڈکاریں اگل رہے تھے۔ گوسیاہ کتے کا خوف اور اندیشہ میرے پورے حواس سپردگی پر حکمران تھا کہ کب وہ اپنی سفید زنجیر الگ کیے مجھ پر چھا جائے مگر پھر بھی۔ میں..... میں..... میں تھیں آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔ کار جہاں دراز ہے نا۔ روشن دان سے سورج کی مدھم کر نہیں کرے کے ایک محدود حصہ پر غالب تھیں اور تم۔ تم گلابی پردوں کے اندر، سرخ لباس میں ملیوں، ہلکی سبز روشنی کے سایہ میں، اپنے سیاہ بھورے بال کھولے باہر کی دستخطوں سے بے نیاز، میرے وجود سے منکر، اپنے گھٹنوں میں منہ پھپھائے، تم..... تم کہ سوئی تھیں، جاگ رہی تھیں، رورہی تھیں یا..... باسرت آگئیں خواہوں میں کھوئی ہوئی تھیں..... ایک زمانہ گزر گیا۔

پتہ ہی نہیں چلتا کہ کتنا زمانہ گزر گیا۔ سورج گویا طلوع ہو رہا ہے کہ غروب۔ بانس

کے اس طویل لائن تباہی جنگل میں درندوں سے لڑتی، بھاگتی، ابولہان ہوتی ہوئی جدوجہد کا نام رات ہے اور خود کو سعی سراب کے لیے تیار کرنے کا نام صبح۔ تم نہ جانے کس درخت کے نیچے، اپنے سیاہ بھورے بال کھولے، درندوں سے بے نیاز، مجھ سے منکر سو رہی ہو کہ تمہارے لیے یہی اصل بیداری ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یہ بانس کے اونچے اونچے درخت، خوف ناک درندے، گمان آلود سورج، میں اور میری سعی سلوک وغیر سلوک اور۔ اور تم، سب ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کاٹی پر لہراتے ڈنڈے کا سحر یہ ہول دلاتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ میرا وہم تو نہیں ہے اور حقیقت میں کوئی رخ نہیں ہے صرف ایک ہی سمت ہے۔ اپنے پلٹنے کا نام دوسری سمت ہے۔

”تیل نے مجھے کس قدر زخمی کر دیا ہے۔“

اور وہ سمت..... اور یہ سمت۔ تھیہ گیر جنگل بے کراں ہے اور انہوں نے کہا تھا۔

”سائنس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ ایک انتہائی خفیف سا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ جس ہے

اور یہ..... یہ جنگل ہے۔“ ●●

## جے سی بی

”اچھا بابا۔ جلد پہنچ رہا ہوں..... ہاں کوچنگ ختم کر دی ہے..... ٹھیک ہے۔“

موبائل تپائی پر رکھا اور دیوار گھڑی پر نظر ڈالی..... وہ سب میری طرف تاک رہے تھے۔

امکانی پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے سوال کیا:

’ریاض اب کتنا پورن باقی رہ گیا ہے۔‘

’چار پونم، تین پروزا اور دو نان ڈیٹیلڈ..... گرام سر،‘

’تم لوگوں کے ایکڑام کب سے ہیں۔‘

’مارچ اپریل میں ہوں گے سر ریاض نے جواب دیا۔‘

’اب تو نومبر چل رہا ہے..... کافی وقت ہے۔ پرسوں تک میں The

Necklace ختم کر دوں گا۔ کل تم لوگوں کو چھٹی ہوگی۔ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں

بات جاری رکھی، اب مجھے نکلنا ہے.....'

انگنی پر پڑے پردہ کو ہٹا کر میں کمرے کے دوسرے حصہ میں پہنچا۔ وہ سب ایک ایک کمرہ سے نکل گئے۔ لباس تبدیل کیا۔ چہرے پر تھوڑی روڈو بدل کر دی اور پردہ ہٹایا۔ فیضہ کی موجودگی پر چونک گیا۔

'کیوں؟ تم گئی نہیں؟'

'آپ نے کتاب دینے کو کہا تھا۔ مجھے دودن کے اندر Synopsis داخل کرنا ہے۔ سر نے وارننگ دی ہے، اس کے لہجہ میں تشویش تھی۔

'اور نہ داخل کرنے پر Internal Marks کاٹنے کی بابت کہا ہوگا، کتابیں ٹولتے ہوئے میں نے اس سے استفسار کیا۔' کچھ پڑھاتے بھی ہیں وہ؟

'بہت سمجھاتے ہیں وہ؟ اس نے وہ پڑھ دیتے ہوئے جواب دیا۔

'اور اپنے تجربات، واقعات اور کارنامے بھی خوب بیان کرتے ہوں گے؟'

'بہت سر..... اور انھوں نے اردو اسٹوڈنٹ کے لیے ٹور بھی چاک آؤٹ کیا ہے؟'

'پھر تو تمہاری معلومات میں اور اضافہ ہوگا دوران گفتگو اس کی مطلوبہ کتاب مل گئی تھی۔ میں نے اسے اس کے حوالہ کرتے ہوئے کہا یہ کتاب ان کے پاس نہیں ہے؟'

'انھوں نے بتایا تھا کہ وہ اسے اپنے ذخیرہ کتب میں تلاش کریں گے۔ تاہم انھوں نے ان کی دوسری کتاب بال جبریل، عنایت کی۔'

'بہتر یہی ہے کہ تم اپنی کورس کی کتاب 'باگ در' میں ٹھکری رہو اور بال جبریل میں مت الجھو۔'

'کیا وہ میرے Synopsis کے لیے مددگار ثابت نہیں ہوگی؟'

'اچھا..... مجھے فوری نکلنا ہے..... پھر کبھی میں آگے بڑھ آیا..... قفل

ڈالتے ہوئے میں نے دیکھا پڑوس کے مکان کی دیوار سے سٹ کر دیں پندرہ سو سو رہے تھے..... وہ تو میرے اسٹوڈنٹ کی مہربانی تھی کہ انھوں نے میرے کمرہ کی دیوار سے

ہول کے کانٹے بچھا دیے تھے ورنہ مجھے بھی روز اس کا نظارہ کرنا ہوتا..... حالانکہ یہ شہر کا نیا علاقہ تھا۔ میں نے اپنا کمرہ شہر کے آخری کنارے، لپ سڑک حاصل کیا تھا۔ ابتدا میں ایک تو

کمرہ آسانی سے دستیاب ہو گیا تھا دوسرے یہاں کوچنگ کے لیے طلباء کی کثیر تعداد مل گئی تھی۔ اطراف میں چار پانچ کالجز چل رہے تھے۔ شہر کے اس کنارے نو دو لیتے اور تعلیم یافتہ

خاندان آباد ہو گئے تھے۔ میرے یہاں کوچنگ کے چار Batches چلا کرتے تھے۔ اس طرح میرے M.E. ہونے کا کچھ نہ کچھ مداوا ہو گیا تھا اور میں اپنے بھائی بھائی پر بوجھ نہیں بنا

تھا..... میں کافی جگہوں پر انٹرویو دے چکا تھا مگر ہر بار نامعلوم وجوہات کی بنا پر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ باہر جانے سے مجھے چڑھتی..... ہر جگہ خلفشار اور بدامنی..... یہاں سکون تو

تھا..... مگر ادھر ادھر سو روں نے اس علاقے کو اپنی چیخ و پکار سے پرانگندہ کر دیا تھا..... سڑک کے اس طرف بوڑھا برگد کا لمبا چوڑا درخت اپنی جٹائیں زمین پر نکالے کھڑا تھا۔ یہاں

سو زمینیں آسکتے تھے کیوں کہ برگد کے اطراف دن رات لوگوں کا اجتماع ہوتا رہتا۔ اطراف کے دیہاتوں کے لوگ اپنا اپنا سامان زمین پر رکھے، سستانے کے لیے رُکے رہتے اور گپ شپ کیا

کرتے۔ ہر کسی کے لیے برگد کا درخت پناہ گاہ بن گیا تھا۔ ایسے میں سو روں کا یہاں رزکنا محال تھا۔

میرے بڑے بھائی نے مجھے بتایا کہ کوئی بچپن میں سال ادھر کی بات ہوگی، چاہے

مولوی ہو کہ قاضی، پنڈت ہو کہ پجاری، عالم کہ جاہل، امیر کہ غریب..... تمام شہر کا یہ وطن رہا کہ بچوں کو اپنے گھروں میں فطری حاجت رفع کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے صبح وشام، سردی ہو کہ دھوپ یا بارش، سچے اپنی فطری ضرورتوں کو اپنے گھر کے قریب کی نالیوں میں رفع کرتے اور گھر کے بڑے اپنے اپنے مکانوں میں اس علت سے فارغ ہوتے۔ اپنے گھروں میں اس کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ ہر گھر میں اُن کے آباد اجداد نے اس غرض کے لیے گہری باولیاں کھود رکھی تھیں۔ اُن دنوں ڈرنج کا کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا۔ شہر کوئی چالیس وارڈ میں آباد تھا۔ ہر وارڈ میں دو تین محلہ جات ہیں۔ ہر محلہ کی چند جگہوں مسجد، مٹھ، مدرسہ، عاشور خانے، مندر، تعزیہ خانہ، شادی خانے، مارکٹ..... پر اس علت کے نمونے، صبح وشام آنکھوں کو کراہت سے دوچار کرتے۔ یوں دنیا کا کام بڑی فراغت سے چل رہا تھا۔ بھائی بتلاتے ہیں کہ بھلا ہوشریمان سریکار صاحب کا کہ انھوں نے شہر کی میونسپل اتھارٹی اور مہران کے سامنے ”خنزیر کاری“ کی اسکیم پیش کی۔ اس اسکیم کے خمینہ، گھمداشت، آباد کاری اور اونچے نیچے کی تمام تفصیلات کا احسن انداز میں جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اسکیم سے متوقع آمدنی کا بھی اندازہ لگایا گیا تھا جو کھاد کی صورت میں حاصل ہونے والی تھی..... اسکیم منظور کر لی گئی اور دو تین ماہ بعد ہی شہر کے ہر محلہ میں چار پانچ سو رنظر آنے لگے۔ لوگوں نے دیکھا کہ اُن کے کام پر نکلنے تک ان کے محلہ نمونوں سے پاک ہوتے اور لوٹنے تک یہ سو محلہ کی چوکیداری میں ادھر اُدھر آوازیں لگاتے گشت کرتے ہوتے..... دنیا کا کاروبار چل رہا تھا۔ آدمی اس لحاظ سے برتر ہے کہ وہ سال بھر میں ایک ہی بچہ دنیا کو دے سکتا ہے مگر سو رنظر اس لحاظ سے شاید کمتر ہے کہ وہ سال بھر میں آٹھ نو بچے دنیا کو دینے پر قادر ہے..... بھائی بتلاتے ہیں کہ موجودہ دس سالوں میں ہر کوئی شریمان سریکار کو لجن طعن سے نوازنے لگا۔ مگر اتھارٹی خاموش ہے۔ سوچ

دچار کر رہی ہے۔

سوچ کے دھارے کو پلٹتے ہوئے میں نے مولر سائیکل کو بک لگائی۔ موسم سرما ہے مگر دھوپ تیز تھی۔ کولتار کی سڑک پر کہیں کہیں مانع بہ رہا تھا۔ آرش کالج کے کھلے کینٹین پہنچا تو حسب توقع، مولسری درخت کے سائے میں واجدہ میری منتظر تھی۔ واجدہ کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ ہر کوئی اس کے چہرہ کو دیکھنے سے پہلے اُس کے سید پر نظر ڈالنے میں اپنے آپ کو مجبور پاتا اور پھر اُسے زندگی بھر اپنے مصورتہ ہونے کا ملال ہوتا۔ وہ مجھے غصہ آور نظروں سے گھور رہی تھی۔

’اتنی دیر لگا دی‘

’بات کیا ہے میں نے بیٹھے ہوئے کافی کی آواز لگائی، کیوں بلا یا تھا‘

’تم کب سدھو گے‘

’کیوں؟ اب کیا ہوا‘

’اتنی گرمی پڑ رہی ہے اور کافی‘

’دو تھمس اپ میری آواز گونجی خوش‘

’کو چنگ میں مصروف تھے‘

’اس ارضی کا کارن‘

’نو کری کی کوششیں تیاگ دیں کیا؟‘

’مجھے اس دھوپ میں کیوں ڈسٹرب کیا‘

’کب تک اس کوچنگ کے سہارے زندگی کاٹ سکو گے‘

’میں ہزار ملتے ہیں‘

’کینٹین والا چائیس بڑا رکھتا ہے  
’کیا اسی لیے کالج آتی ہو۔ کس نے بتایا تمہیں  
’اُردو کے پروفیسر صاحب نے  
’مہاشیہ یہ معلومات بھی شیر کرتے ہیں  
’صرف مجھ سے‘

’ہر ایک کو اسی غلط فہمی میں رکھتا ہے..... میری آمدنی کے تقابل میں کہا ہوگا  
’بے چارے فریج کٹ داڑھی رکھتے ہیں اور میرا تو آخری سسٹر ہے  
’تو..... اچھا بلایا کیوں۔ بس ہانگے جا رہی ہو  
’ابھی ہانگا کہاں ہے۔ وشنو ورنہن کی کتھا نہیں سنو گے‘

میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ’پھر کیا کیا انہوں نے..... میرے ذہن میں  
’وشنو ورنہن صاحب کا سراپا ابھر آیا۔ سُرخ سپید چہرہ، طوطے جیسی ناک، کشادہ پیشانی، سرخی  
’مائل بال، بڑے بڑے کان، پتلے پتلے ہونٹ، کرجھی آنکھیں، عمر کوئی 45 سال، بے حد ذہین،  
’آواز بھرائی ہوئی، سکا لڑیو نیورسٹی حلقہ تک بااثر، بے اندازہ دولت مند کے مالک، کئی تعلیمی، طبی  
’اور تجارتی اداروں کے مالک، خاندان کے واحد چشم و چراغ، غیر شادی شدہ اغلباً  
’کنوارے..... واجدہ کا معاملہ نہ ہوتا تو نہ پسند کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

’وہ کیا کرے گا مخفی طوطا واجدہ کے لہجہ میں حقارت تھی۔  
’تو ہوا کیا؟‘

’دراصل میں نے دو روز سے اس کی کلاس انڈینس کی تھی۔ اس اثنا میں ہر ایک سے  
’میرے بارے میں دریافت کرتا رہا اور ڈپارٹمنٹ میں آنے کے لیے کہا، میں اب کے پوری

’تیاری کے ساتھ ڈپارٹمنٹ گئی تو اس نے حد ہی کر دی اور کہا:  
’آؤ سوئی..... تمہارے بغیر تو میرے لیے یہ کالج ویران ہے  
’یہ تو انہوں نے ٹھیک کہا میں نے ہنستے ہوئے کہا۔  
’سوئی یا ویرانی؟ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

’سوئی ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ آم کے درخت تلے دو ایک  
’لیکچرار براہمان ہو گئے تھے۔ اسٹوڈنٹ کا ایک گروپ داہنی جانب ہمیں کن آنکھوں سے دیکھ  
’رہا تھا۔

’کیا تم نے چکھا ہے کبوتر؟ کس کی اتنی مجال کہ مجھے چھو بھی سکے واجدہ کا چہرہ تمہنا گیا  
’تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

’میں نے جب طوطے سے کہا کہ اس کی یہ ساری بات چیت اپنے موبائل میں  
’ریکارڈ کر لی ہے اور اُسے یونیورسٹی کانویشن میں شلت ازبام کرنے والی ہوں تو اُس کی حالت  
’دیکھنے کی تھی۔‘

’دیکھو ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں تو سنجیدگی کے ساتھ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پر ماتما  
’کی سوگندہ..... اُس نے لگھیا نے کی حد کر دی۔ سچ سچ ہی وہ بہت نازک اور ڈرپوک  
’نکلا۔ میرے ایک نفسیاتی واری سے وہ کانچ کے مرتبان کی طرح ٹوٹ گیا۔  
’پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

’کیا شادی کا اُس کے لہجہ میں استہزا تھا۔

’تمہارے ایکشن کا تم کالج میں رہ نہ پاؤ گی، اُن کی پہنچ اوپر تک ہے  
’ایسا کچھ نہ ہوگا۔ وہ واقعی مجھے چاہتا ہے۔ میں نے اُس سے اٹھک بیٹھک بھی



کرائی ہے۔ اُسے اپنی عزت اور مان کا بڑا خیال ہے..... اچھا رحمان، سچ بتانا میں کہی  
لڑکی ہوں۔ سچ بتانا

میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور خاموش رہا.....

’دیکھو..... میں کچھ بھی خیال نہیں کروں گی۔ پلیز‘

’تم Possessive اور لوہی ہو، میں نے تھوڑا سا اُداس ہو کر جواب دیا۔

’ہاں..... میں لوہی تو یک دم سے ہوں۔ مجھے لوہے کی دولت کا، شہرت کا،  
عیش و عشرت کا، گھومنے پھرنے کا، شان دار زندگی کا، شان دار ماحول میں جینے کا، مجھے لوہے  
ہے پاور کا‘ اس کی آواز میں جوش تھا۔

’اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میں نے بے بسی سے کہا۔

’کیوں مجھ سے شادی کا خیال تیاگ دیا ہے‘

’تم بھی کیا.....‘

’ہاں..... ہاں تم کو تو عشق کا زکام ہوتا رہتا ہے‘

’کیا فالٹو باتیں کرتی ہو۔ اسی لیے مجھے کال کیا تھا..... میں ہتھے سے اکھڑ سا

گیا۔

’اس خیال خام میں مت رہنا کہ کسی کو چہرے پر مہربان رہوں گی‘

’مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے، میں نے پلٹ کر ترکی بہ ترکی جواب دینے میں ہی

عافیت سمجھی۔

’پھر کیوں میرے پیچھے تین سال سے پڑے ہو۔‘

’اب تم بلاؤ بھی تو نہیں آؤں گا‘

’برامان گیے کبوتر‘..... میں نے دور سے دیکھا کہ ہر ش وردھن اور پردیسر باسط  
آدم کے گوشہ کی طرف رواں ہیں۔ پردیسر ہر ش وردھن آرام کرسی پر چھنس گئے اور باسط  
صاحب ہماری جانب آرہے تھے۔

’واجدہ میں ڈپارٹمنٹ میں تمہارا ویٹ کروں گا۔ انہوں نے ایک خشکیوں نگاہ مجھ پر  
ڈالی اور گویا ہوئے۔

’رحمان‘ آج کے اخبار میں خلیج میں Vaccancy کا اشتہار ہے۔

’شکر یہ جناب ان معلومات کا مگر میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ میرے جواب کو ان  
سنا کیے چل دیے۔

’اپنے بھیا بھائی اور بچوں کا خیال کرو۔ کوئی ڈھنگ کی نوکری کیوں نہیں تلاشتے۔

’کب تک وہ تمہیں.....‘

’میں کسی کے سہارے نہیں جی رہا ہوں‘

’نہیں ہزار میں کتنے گھر پر دیتے ہو‘

’تم سے مطلب؟‘

’تم نے لائن ہی غلط جتی۔ انجینئرنگ وغیرہ میں اب کوئی چارم نہیں رہا۔ ہمیں اب

قانون پڑھنا چاہئے۔‘

’تم پڑھ رہی ہو‘

’میں..... میں قانون کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔‘

’میں چلتا ہوں، آج کافی وقت نکل گیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے ویزا کو اشارہ کیا۔‘ تم

اُردو کے ٹور پر جا رہی ہو

میں احمقوں کے ساتھ ایک منٹ بھی رہنا پسند نہیں کرتی۔

نفسیہ بتا رہی تھی کہ ٹور لازمی ہے

وہ فرسٹ سیم والوں کے سامنے کچھ بھی ہانکتے رہتے ہیں۔

اُس نے بل کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ انتظار یہ کیا بھی بہت کچھ تھا۔ ہنستے ہوئے بس

اتنا کہا اُدھار میری طرف۔

پتہ نہیں کیوں، مجھے اُس کے دانت پہلی بار بڑے نوکیلے لگے۔

کمرہ پر پہنچا تو گرمی ویسی ہی تھی۔ فین آن کیا، سامنے تپائی کے پاس MYF کا دعوت نامہ پڑا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی لگا تار میٹنگیں ہو رہی تھیں۔ میں نے شام کی کوچنگ ہی بند کر دی تھی۔ اسٹوڈنٹ جیس بی جیس تھے..... دعوت نامہ کھولتے ہی مجھے ایک قسم کی کوفت اور لرہتی ہوتی۔ ہر دعوت نامہ کی ابتدا کچھ اس قسم کی تحریر سے ہوتی۔

محترم.....

سلام علیکم۔ جیسا کہ آپ اس بات سے آگاہ ہیں کہ MYF گذشتہ دس

سالوں سے ملت کے مذہبی، تہذیبی، معاشرتی مسائل پر نمایاں اور مثبت انداز میں سرگرم عمل ہے..... ہمیں نے بے دلی سے تاریخ اور وقت دیکھا۔ آج ہی عصر کے بعد ایمر جنسی میٹنگ طلب کی گئی تھی..... میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ جو میٹنگیں عصر کے بعد بلائی جاتی رہی ہیں، وہ تقریباً پہلے سے طے شدہ نتائج کی حامل ہوتی رہی ہیں۔ ہمارا کام محض ریزولوشن پر دستخط کرنا ہوتا..... بیروں پر خوب شہنشاہ پانی ڈالا اور بستر پر اپنے آپ کو ڈھیر کر ڈالا اور سو پنے لگا۔ پتہ نہیں کس دھن میں فورم کی ممبر شپ قبول کی تھی۔ مجھے ان کی سرگرمیوں اور بیانیات سے دل چسپی ضرور تھی مگر وہاں کے تصنع آمیز ماحول سے گھٹن

ہوتی۔ کئی بار سوچا کہ فورم سے استعفیٰ دے دوں مگر اسے عملی جامہ نہیں پہناتا تھا..... کیا میں کسی انجانے خوف سے جتا تھا؟ یا مجھے کسی تحفظ کی ضرورت لاحق تھی؟ یا میں کسی پشیمانی میں جتا ہوں۔ میں نے اپنا بار بار تجربہ کیا مگر مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ نیند پٹکے پٹکے مجھ پر غالب ہوتی گئی۔

خواب میں مجھے واجدہ کے چمکتے دانت پھیلنے دکھائی دیتے رہے.....

جاگا تو JCB کا خیال آیا۔ آج شہر میں چاروں طرف JCB ہی کا چرچا اور بحث و مباحثہ ہے۔ اسی لیے تو شہر کے میٹس ٹرے اور JCB کے شور اور گڑگڑاہٹ سے خوف زدہ ہو کر نئے علاقوں اور کالونیوں میں بھاگ آئے تھے..... یہ JCB مختلف آکار کے مختلف ہیٹ اور سائز کے مختلف مقاصد کے مختلف کاموں کے مختلف..... ان کا کام نشان زد عمارت، مقامات اور جگہوں کو زمیں بوس کر دینا تھا۔ ان میں تاریخی آثار کی عمارتیں بھی تھیں۔ قبرستان، مناد، مساجد، کمانیں، نقارخانے، غیر مجاز تعمیرات..... غرض وہ کسی ہی جذباتی و انتہائی کی حامل ہوں، کمشنر کے آرڈر پر، پولیس کی نگرانی میں نیست و نابود کی جارہی تھیں۔ قدیم تہذیب و تمدن کے آثار اور نشانیوں کو، نئی تہذیب و تمدن میں متبدل کرنے کا عمل، ایک عالم گیر حقیقت کا مظہر بنتا جا رہا تھا.....

کوئی آٹھ روز پہلے، جامع مسجد کے پچانک سے متصل 10 x 15 کا ایک کتبہ تھا جس کے شمال اور جنوب پر دو قدیم کتبے تھے۔ لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ یہ دو بزرگوں کی قبریں ہیں..... کمشنر نے MYF کے ممبران اور چند ذہنی علم حضرات کو اپنے کیمپ میں طلب کیا۔ دوران گفتگو کمشنر نے ہماری ایک روایت کو کوٹ کرتے ہوئے استحضار کیا کہ اب ان قبروں کا کوئی جواز ہے یا روایت پر سوالیہ نشان لگایا جائے؟ سب بھونچکے رہ گئے اور واپس لوٹ آئے۔

اُسی رات ایک بچے پولیس کی جمعیت میں JCB نے اُن قبروں کو زمین کے برابر کر دیا۔ ان کتوں کی تباہی کے بعد، پھر سے ایک بار شریمان یشونت راؤ نے MYF کو اپنی درخواست دی۔ دو تین روز اس درخواست پر غور کیا جاتا رہا..... قصہ دراصل یہ تھا کہ جامع مسجد کے باہری حصہ سے اُس کی ایک جنوب مغربی دیوار قریب 100' تک ہے۔ یشونت راؤ کی کوٹھی کی شمال مغربی دیوار قریب 80' تک جاتی ہے۔ ان دونوں دیواروں کے بیچ ایک "5'5" کا خالی فینچ ہے۔ عام دنوں اور بالخصوص بارش اور سرما کے موسم میں اس فینچ کو سینکڑوں سو رانا بیہیرا بنا لیتے اور رات بھر اپنی بے ہنگم آوازوں سے مصلیان اور کوٹھی کے کینوں کے لیے اذیت اور مصیبت کا باعث بنتے، پھر دن میں اُن کی گندگی سے ہر کوئی بیزار تھا..... یشونت راؤ نے MYF کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اس فینچ کو یا تو مسجد کمیٹی یا یشونت راؤ اپنے خرچ سے چسپاں دیوار سے بھر لیں۔ چسپاں دیوار تعمیر کرنے والے کی ذاتی دیوار متصور ہوگی جس پر فریق ثانی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور اس اذیت سے نجات مل سکے گی..... یشونت راؤ نے مسجد کمیٹی کے فیصلہ کو مقدم کرنے کی رضامندی ظاہر کی تھی..... تجویز معقول اور مصلحتانہ تھی۔ کسی صاحب نے میٹنگ میں یشونت راؤ کے HES کے سکرٹری ہونے کی بابت سوال اٹھایا۔ جواب میں کسی نے اُن کے MYF کا معاملہ رکن ہونے کی بابت کہا اور انہیں سمجھایا گیا کہ کسی کو بھی اپنے سنگھٹن سے وابستہ ہونے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ آج کی ایمر جنسی میٹنگ میں یشونت راؤ کی تجویز پر فیصلہ لیا جاتا تھا۔

کرتا پا جامہ زیب تن کیے، میں کمرہ سے باہر نکلا۔ برگد کی جٹاؤں اور شاخوں کے درمیان سورج زوال کی طرف گام زن تھا۔ موٹر سائیکل سٹارٹ کیے مسجد کی جانب بڑھا۔ نماز کے بعد بھی میٹنگ حسب توقع دیر سے شروع ہوئی۔ حسب توقع یشونت راؤ کی تجویز کو بالاتفاق

منظور کر لیا گیا۔ ریزولوشن میں لکھا گیا کہ یشونت راؤ کو 2 3/4 x 80' جگہ کا معاوضہ دیے جانے کا بندوبست کیا جائے اور مسجد کی ذاتی چسپاں دیوار تعمیر کی جائے۔ فینچ کو فوری طور پر ایک متصل دیوار کے سہارے بند کیا جائے۔ MYF مسجد کے باہری حصہ 20x15 پر ایک شاپنگ کا پائلکس تعمیر کرے گی۔ میٹنگ سے باہر نکلنے کے بعد یشونت راؤ سے ملاقات ہوئی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے انہوں نے فیصلہ پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں وہاں سے نکلا اور گھر کی جانب چلا۔ بھائی اور بھالی سے ملے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔

دن رات JCB کی گھڑ گھڑاہٹ میں کھٹتے رہے۔ اس عرصہ میں واحدہ کی کوئی کال نہیں آئی تھی۔ میں نے بھی خاموشی سادھ رکھی تھی۔

کرسمس کے دوسرے دن کو چنگ کے خاتمہ پر انیسہ نے تنہائی میں کہا:

'سر آپ کو علم ہے.....'

'اب سسپنس ختم کرو۔ تم بات سیدھے کیوں نہیں کرتی ہو؟'

'سر..... کیسے کہوں..... آج واحدہ بیگم اور وردھن صاحب کا لگن ہے'

'کیا..... مجھے سکتہ سا ہوا۔'

'انوپم منگپ میں دو پہر 12.34 بجے'

'اب تم جاؤ یہاں سے پلیز..... وہ چلی گئی اور میں دیر تک روہا سار رہا۔'

پھر اٹھائیس ڈسمبر کو چنگ کے وقت سے پہلے انیسہ گھیرائی سی آدھسکی۔

'سر آپ کو علم ہے.....'

'خدا کے لیے..... میں نے چڑ کر کہا۔'

'کل شام پروفیسر ہرش وردھن کا دیہانت ہو گیا.....'

’کیسے.....؟‘

’وہ تو مجھے علم نہیں مگر سنا ہے کہ پولیس واجدہ کو پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے گئی ہے‘

میں نے اُسے رخصت کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن کی راہ لی..... مگر راستہ ہی میں

واجدہ کو نیلی کار میں دیکھا۔ میں کمرہ پر لوٹ آیا۔

دو چار روز بڑی پریشانی میں گزرے۔ میں نے بار بار واجدہ کو فون کیا مگر اُس سے

رابطہ نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنا نمبر بدل لیا کیا؟ میں نے سوچا۔

چار پانچ دن بعد ہر ش وردھن کی موت پر تفصیل سے خبر آئی۔ اخبار میں لکھا تھا کہ

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اُن کی موت کی موت Cardiac Arrest کے باعث ہوئی۔ دہلی

وردھن پر کوئی الزام نہ تھا۔ وردھن کی موت کو قدرتی قرار دیا گیا..... مجھے خیال آیا کہ کانچ

کا مہتان چھن سے ٹوٹ گیا۔

مگر شہر میں JCB نے کانوں کو اپنی آوازوں سے بہرہ بنا رکھا تھا۔ شہر کے سوارا ب

بھاری تعداد میں ہماری نئی کالونیوں میں آباد ہونے لگے تھے۔ یہ سلسلہ چار پانچ ماہ چلتا رہا۔

جون کے مہینہ میں بھائی اور بھابھی نے مجھے بلا بھیجا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے

لڑکے کا داخلہ AIMS میں کرنا چاہتے تھے۔

’کم از کم ایک بچہ تو معیاری اور اونچی جگہ تعلیم پائے۔ تم کوشش کرو تو یہ ممکن ہے۔‘

میں اپنی زندگی کی ساری پونجی اس بچے کے داخلہ اور تعلیم و تربیت پر لگا دوں گا۔ بھائی نے

حسرت سے کہا۔ میں نے کچھ کہنا مناسب خیال نہ کیا۔

الصبح، شکور کو ساتھ لیے، AIMS پہنچ گیا۔ وہاں ایک لمبی قطار پہلے سے موجود

تھی۔ نیجر کے کمرہ میں ہمیں ایک سلپ دی گئی۔ جس میں نام، کلاس اور موبائل نمبر درج کرنے

کے لیے کہا گیا..... کوئی آٹھ بجے نیلی کار AIMS میں در آئی۔ دہلی وردھن کا ر سے

اُتری اور اُس نے اپنا گولہ اتار کر قطار پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس

نے اپنا گولہ پھینک لیا اور اپنے کیبن کی طرف پھل دی۔ لوگ اپنے انٹرویو دینے کیبن میں آتے

جاتے رہے۔ ایک لاکھ، ڈیڑھ لاکھ، تین لاکھ، چار لاکھ کے ڈومیشن پر خوشی اور طمانینت کا اظہار

کرتے رہے۔ میں قطار سے الگ ہو جانے کی سوچ رہا تھا کہ نیجر میری طرف آیا اور آہستگی

سے کہنے لگا۔

’میڈم نے آپ کو پھانک کی طرف ٹھہرنے کے لیے کہا ہے‘

میں وہاں سے پھانک کی طرف آیا۔ شکور بار بار ”چا چا کب ایڈمیشن ہوگا“ کی رٹ

لگائے جا رہا تھا۔

کوئی آدھا پون گھنٹہ بعد میڈم کیبن سے نکلی اور اپنی کار میں سوار ہوئی۔ ڈرائیور نے

کارٹرن کی اور پھانک پر بریک لگائے۔ ڈرائیور نے مجھے سلام کیا تو میں نے جانا کہ وہ واجدہ کا

بڑا بھائی یا سین ہے۔

کھڑکی پر ہاتھ رکھے دہلیا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

’تمہارے بھتیجے کے داخلہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے..... دراصل مجھے اپنے اداروں

کے لیے ایک شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ CEO کی ضرورت ہے۔ تمہیں پچاس ہزار ابتدائی

مشاہرہ ملے گا۔ منظور ہو تو کل بچے کا فرمی ایڈمیشن کرالینا۔‘ میرے کچھ کہنے سے قبل کار ایک دم

سے اشارت ہوئی اور دھول اُڑاتی غائب ہو گئی۔

گھر بڑی مشکلوں اور رکاوٹوں کے بعد پہنچا۔ شہر ملے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

سے انفراسٹرکچر کا کام بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شکور نے 'میرا ایڈمیشن ہو گیا' کی رٹ لگائے تاپنے لگا۔ بھائی کو آفس سے آنے میں دیر تھی۔ وہ ریٹائرڈ ہو کر ایک پرائیویٹ فرم میں کام کر رہے تھے۔ بیچے بھی اسکول سے دیری سے آتے۔ بھائی نے کوچ پر لیٹ جانے کا مشورہ دیا اور خود گلاب جاسن تیار کرنے کا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔ میں صوفے پر لیٹا اخبار میں مشغول ہو گیا۔ کھڑکیوں سے سڑکوں اور JCB کی ٹلی جلی بے ہنگم آوازیں آتی رہیں۔ پینٹیں ان دونوں سے کب نجات ملے گی۔

شام بھائی آئے تو ہم دونوں نے ایک عرصہ بعد مل کر کھانا کھایا۔

”میں جانتا تھا صرف تم ہی یہ کام انجام دے سکتے ہو۔ کتنا طلب کیا واجدہ نے“

میں نے بات ٹالی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی نے موسم کا حوالہ دیتے ہوئے یہیں سو جانے کے لیے اصرار کیا۔ تمینہ اور رخشیدہ نے بھی رُک جانے کو کہا۔ مگر مجھے تنہائی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی.....

کمرہ پہنچنے تک رات اپنا ڈیرہ ڈال چکی تھی۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بار بار بجلیوں کے کڑکنے اور چمکنے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے لائٹ آف کی اور بستر پر لڑھک گیا۔ آنکھیں میچے دیر تک جاگتا رہا اور پھر پینٹیں کب مجھے نیند آگئی۔

رات خواب میں دیکھا کہ میرے کمرے کے آ طرف JCB مسلسل چکر لگا رہا ہے۔

ڈرائیور کی سیٹ پر دینتیا عریاں سینہ کے ساتھ دانت چرکا رہی تھی.....

ابھی اندھیرا تھا۔ کھڑکیوں سے مدھم رڈشی جھٹک رہی تھی۔ میں نے لائٹ آن کی اور ٹھٹھک گیا۔ آج تو اور دنوں کے مقابلہ میں، بہت بڑی تعداد میں انہوں نے میرے کمرے کو اٹ سا دیا تھا۔ کمرہ میں اُن کا داخل ہونا ایک دشوار کن مرحلہ تھا۔ پھر بھی آج وہ کسی نہ کسی طرح

میرے کمرے میں بڑی تعداد میں بکھر گئے تھے۔ میں نے مالک مکان سے کھڑکیوں میں پت لگوانے کے لیے کہا تو اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ رہنا چاہو تو رہو ورنہ کمرہ خالی کر دو۔ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنی طرف سے پردہ لگائے مگر دوسرے ہی دن پردے پھاڑ دیے گئے..... کیا کوئی مجھے اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہے، میں نے سوچا تھا، کمرہ لب سڑک ہی تھا اور ہر آنے جانے والے کی پہنچ میں تھا۔ میں نے سب سے پہلے بستر پر سے اٹھیں سمیٹا اور سر ہانے کو بھی صاف کیا۔ پھر پورے کمرے کو جھاڑ دوئی اور پتوں کا ڈھیر Sweeper Pan میں اکٹھا کیا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ڈسٹ بن بگ پکڑے میں نے دروازہ کھولا اور دلپیز پر ہی میرے پاؤں سن سے ہو گئے۔

برگد کا طویل قامت قدیم درخت اپنی جٹاؤں سمیت ڈھیر ہو چکا تھا۔ اُس کی بائیں جانب JCB ساکت کھڑا تھا۔ دو دروازے مجھے کوئی سڑک کھائی نہیں دیا۔ دیر تک میں اکیلا ہی کھڑا رہا..... ●●

## اُس گلی سے

موسم کھر، پتہ نہیں کتنے عرصہ سے اپنے نوکیلے پنچے میرے وجود میں گاڑ چکا ہے۔ وہ اپنی نوکیلی خم دار چوڑی سے میرے ذہن میں بیوست ایک ایک ہیولے کو نوج کر پھینکتا رہا ہے۔ اس کے اندر سرسراتی اونگھ اور غنودگی میرے اندر بھی رچ بس گئی ہے۔ دونوں سلاخوں کے بیچ میں نے دیکھا، اب بھی سارے کا سارا دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ پل پل گزرتے ہوئے نیلے، بق وودق میدان میں ببول کے درخت، مردہ تالابوں میں ساکت پڑا پانی گویا وہ ان سب پر محیط، میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اس پر میرا کب اختیار تھا۔ یہ شب کلفت تو اس لیے سفر کا حاصل ہے۔ حالانکہ میرا یہ سفر بے فیش بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس سے مفر کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آئی.....

مطلوبہ رواگلی سے پہلے کا سارا عرصہ خوف اور اندیشوں کا اثاثہ تھا۔ ان دنوں میں اپنے کالج کے ساتھیوں سے خواہ مخواہ غیر متعلقہ گپ شپ کیا کرتا تھا تا کہ اس تذکرہ کا سامنا نہ

ہو سکے جس امر کا فی کفنگلو کے تصور سے ہی میرے اندر خوف اور شکستگی کا احساس جاگتا تھا۔ یہ ایک عجیب صورت حال تھی۔ میرے تمام ساتھی میری ایک ایک حرکت، میرے چہرہ پر ابھرتے تاثرات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کر رہے ہوتے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ وہ سب اندر ہی اندر ایک فتح مند انبساط اور عرصہ سے چلی آ رہی کلفت سے اپنے آپ کو آزاد پارہے ہیں۔ تب مجھ پر غنودگی کے سائے لہجے ہو جاتے۔ میں نے یاد کیا گویا شیر ہوئی ہم زاد پوری طرح مسلط ہو چکا ہے.....

کالج کے اس گھٹن زدہ ماحول سے بچنے کے لیے میں ایک لمبی رخصت پر جانا چاہتا تھا مگر جواز کی تلاش ایک لازمی ضرورت بن کر رہ گئی تھی۔ طبعی جواز میرے اندر ایک بجزمانہ احساس جگاتا۔ ایک دن بولے گل کے پریشاں نکلنے کو بڑی بے دلی سے واقف کر رہا تھا کہ اینڈر نے دوست کا تار میرے حوالے کیا۔

”کاف شہر میں ہے۔ فوری نکلو“

غنودگی کا سرسرا تا سا یہ مجھ پر محیط ہوا۔

میں جہاں رہتا ہوں وہ شہر کی بہت چھوٹی سی وقف بستی ہے۔ پتہ نہیں کس نے اس وقف بستی کو ”گیارہ گلی“ کا نام دیا تھا۔ تھوڑی بلندی سے اس بستی پر نظر دوڑائی جائے تو اسے گیارہ گلیارے کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ ہر گلی سے متصل چندر ہائشی مکانوں کے سلسلے تھے۔ ان گلیوں کے بیچوں بیچ سے سیاہ سنگ سے پانچ راستہ گزرتا تھا جس کا ابتدائی سرا گریٹر مندر سے شروع ہوتا اور آخری سرا درگاہ خنداں ماں پر ختم ہوتا۔ ہر گلی سے ملحق راستوں پر مندر اور درگاہ سے متعلق اصحاب نے پتہ نہیں کیوں روایتی انداز کی قندیلیں، نیلے اور سبز رنگ شیشوں کے مکعب نما حلقوں میں جلائے رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ روشنیوں کی

یہ تقسیم اس نزع کا اعلان نامہ تھی جو وقف جائداد سے متعلق تھی۔ بہر حال رات بہت بلندی سے اس ہستی کا مشاہدہ کیا جائے تو ایسا لگتا کہ شہر کے اس حصہ پر ایک طویل قامت مور اپنے پر پھیلائے بیٹھا ہے جس کی کلفتی درگاہ ہے اور پچھلا حصہ مندر..... ان گلیوں کے سارے مکین حکومت کے کسی نہ کسی شعبہ میں ملازم تھے۔ وقف جائداد کا تنازعہ، مقدمہ، اور ماحول کا تشیخ اکثر ان کے چہروں سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔ چاہے کوئی موسم ہو، اس وقف ہستی پر کھراوردھند مسلط رہتی۔ ادھر کے مصاحب اسے خنداں ماں کا فیض کہا کرتے اور ادھر کے متوالے اسے نگریشور کی مایا خیال کرتے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ مندر سے متعلق وقف جائداد کی آٹھویں اور آخری گلی میرا مسکن ہے۔ اور درگاہ سے متعلق وقف جائداد کی تیسری اور آخری گلی میں وہ قیام پذیر تھی۔ ہم دونوں کے مکان آنے سامنے تھے۔ وہ اپنے پتاجی کے ساتھ رہا کرتی تھی اور میں اپنی ماں کے ساتھ مقیم تھا..... وہ کامنی تھی۔

کامنی کی یادوں کے ساتھ اوگھ کا پیڑ میری روح میں اترتا محسوس ہوا..... میں تاریلے کلاس سے باہر نکلا اور لڑکھڑاتے قدموں سے مہاجن کے جیمیر کی طرف بڑھنے لگا۔ آخر کار جواز کا روشن دان کھل چکا تھا۔ میں نے ایک لمبی رخصت کے لیے عرضی دی۔ مہاجن کا رویہ میرے ساتھ مشفقانہ تھا۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ ادارہ میں میں ہی اکیلا الگ مسلک سے وابستہ فرد ہوں۔ ویسے اس کی غیر معمولی شفقت مجھ میں علاحدگی کا احساس بھی پیدا کرتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ادھر ادھر اس کے مشکوک مشفقانہ رویے نے بھی مجھ پر غنودگی کے دورے طویل کر دیے تھے۔ اس غنودگی کی ابتدا ایک ہلکی سی اوگھ سے ہوئی تھی.....

شام دروازہ پر دستک ہوئی تو میں طرح طرح کے اندیشوں میں گرفتار ہوا۔ دروازہ

کھولا تو سامنے پنڈت تھا۔ اس کے چہرہ پر کبیرگی ہو یہ تھی۔ آٹھ تاریخ تھی، میں نے ماں کو آواز دی اور اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ ماں نے کرایہ ادا کیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد پنڈت نے اونچی آواز میں کہا۔

”اپنے لڑکے کی آنکھوں پر پہرہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ.....“

اسی لحظہ ہلکے سے چکر کے ساتھ اوگھ کا احساس ہوا۔ اس اوگھ کے کٹن سے ایک بیہولی ابھرتا محسوس ہوا۔ کامنی.....

اس دن اپنے متعینہ انتظاری وقفہ میں میں نے حیات بابا سے اس مسلسل اوگھ کا علاج چاہا۔ انھوں نے کہا۔

”تشریح بیہولی، ہم زاد ہو جائے گا۔ اس عمل سے دور رہ۔ ربط میں ضبط کا خدشہ ہے۔“ ”کون ہم زاد؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنی پسلی سے ان جان ہے۔“ انھوں نے جواب دیا۔

میں کچھ جان ہی نہ سکا۔ حیات بابا کی اس قسم کی باتوں پر لوگ وارفتہ تھے۔ ہمیشہ ان کے اطراف عورتوں کا جمگھٹا رہتا۔ وہ انھیں درگاہ خنداں ماں میں رکھی راگھ کی چنگی دیا کرتے، مورچھل سے پیٹا کرتے۔ یہی علاج شافی تھا۔ میں ان ہی دنوں درگاہ پر آتا جب کامنی اپنی پوجا کی بیٹی میں موٹیے کے پھول لیے نکلتی۔

صبح کی اولین ساعتوں میں میں فرش پر لیٹا اپنے سامنے کی میز کی جانب ٹکلی لگائے ہوتا۔ کمرہ کا پچھلا پٹ زاویہ انعکاس کی زد میں کھلا رہتا۔ گلی میں گزرتے کسی ذی نفس کو ہماری اس خفیہ معاملات کی بھٹک نہیں پرکھتی تھی۔ ماں کو خلل میں ڈالنے کے لیے میں نے بے ترتیبی سے اشیاء پھیلا دی ہوتیں۔ کٹیوں کے گچھے، ٹوتھ برش، وارج، کیکلو ایٹر، ماچس، رنگارنگ پن،

تسلی، برش مشروبات کے ڈبے، کپسول کے ریپ، تعلیمی نوٹس، تاریخ، سبھی بٹھرے ہوتے۔ ان بکھری اشیاء کے بیچ پلاسٹک سے نکی مصنوعی ممنوعہ روشنی کی سیاہ سطح پر خفیہ معاملات کا منظر اچانک طلوع ہوتا، جب سامنے مکان کا دروازہ ہلکے سے وا ہوتا اور کمانی پوجا کی بیٹی میں پہلے سے طے شدہ پر معنی رنگوں کے پھول لیے مندر کے لیے نکلتی۔ موتیا کے پھول درگاہ پر دیدار کا اشارہ ہوتے اور گلاب کے پھول مندر آنے کا عندیہ اور گیندے کے پھول اس کے کمرہ میں بلاوے کا اشارہ۔

اس دن گیارہ گلی میں گہرا کھرا ساکت تھا۔ پھر کبھی میں مصنوعی ممنوعہ روشنی کی سیاہ سطح پر اپنی خفیہ معاملات میں مشغول تھا۔ کئی جاں گسل لمحات کے بعد دروازہ کا پٹ آہستگی سے کھلا۔ میری آنکھیں پوجا کی بیٹی پر جمی گئیں۔ گیندے کے پھول..... اب یہ لمبے اور جان لیوا ہو گئے۔ مقررہ وقت پر ماں کو رخصت کر کے بیٹی بس اسٹینڈ سے لوٹے ہوئے میں نے تین روڈ کی داہنی گلی سے اس کے پتاجی کو حسب توقع آٹو اسٹینڈ کی جانب رواں دیکھا۔ مجھے اپنی تیز تیز چال کو مدہم کرنا پڑا۔ مندر کے دروازہ پر پنڈت کھڑا تھا۔ اسٹینڈ سے سیاہ بیلو سے پٹے تنگ راستے پر چلتے ہوئے میری سانسوں اور دھڑکنوں میں تموج موج زن تھا۔ وہاں پہنچا تو کمانی کو اپنا منظر پایا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کا آئیل ڈھلک چکا تھا۔ چاہے حکم اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ میرے وجود پر طاری ہوا۔ میں نے اپنی نوک زباں چاہے حکم میں دھیرے دھیرے داخل کی اور اسے ہولے ہولے گھماتا رہا۔ کائنات کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ اور تب ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی لمبی اونگھ نہیں بلکہ مجھ پر حقیقی غنودگی طاری ہوتی جارہی ہے۔ ایک ہلکی سی چیخ بھی سنائی دی۔ میں نے سراٹھا کر پیچھے دیکھا پنڈت کے ہاتھوں میں لمبا سا ڈنڈا ہے اور میرے سر کے پچھلے حصے سے خون کی دھار رواں ہو گئی ہے۔ تہر آلود

دھمکیوں کے بیچ ادھ مری چال چلتے ہوئے میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ بہت منت و ساجت اور میری تعلیمی مصروفیات کا واسطہ دینے کے بعد، آنکلا کے لیے تین ماہ کی نوٹس دی گئی۔ پنڈت نے بہ ہر حال پتہ نہیں کیوں اس وقوع کو خفیہ ہی رکھا، میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکا۔ بہستی چھوڑتے ہوئے ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ ہیولی ہم زاد خلیف سے خلیف تر ہوتا جا رہا ہے۔ مگر سب یوں وقوع پذیر ہوگا اس کی کلپنا بھی میں نے نہیں کی تھی۔ بہستی سے منتقل ہوتے ہوئے میں نے حیات بابا سے کہا۔

”میں ہیولی ہم زاد کے معدوم ہونے کے اندیشے میں گرفتار ہوں۔“

انہوں نے چنگنی بجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جو معدوم ہے وہی موجود ہے۔ اس کا خوف نہ کر۔“

یونیورسٹی کے زلٹ سے پہلے میری ماں ایک حادثہ میں دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ کمانی کے پتاجی اس بہستی سے کہیں کوچ کر گئے ہیں۔ کائنات کی گردشوں میں کون کہاں رہ پتہ ہی نہیں چلا۔

”پتہ؟ اس کی کیا ضرورت ہے،“ مجھ سے پہلی بار اپنے رخصتی عرصہ کا پتہ تحریر کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہر حال میں نے دوست کی معرفت کا پتہ لکھا۔

مہاجن نے غالباً ازراہ مزاح مجھ سے کہا۔ ”ایک سال بعد ملو گے“ 1993 کچھ ہی دنوں بعد شروع ہو رہا تھا۔ درخواست دے کر میں نے بس اسٹینڈ کا رخ کیا۔

نیم شب کے دھندلکے میں حسب توقع، بس تقریباً خالی تھی۔ اکا دکا مسافر ہی یہاں وہاں موجود تھے۔ اپنی سیٹ پر لڑھکتے ہی غنودگی کا حملہ ہوا۔ ایک لمبے عرصہ بعد کمانی کے دیدار کی توقع تھی۔ تعجب ہوتا ہے کہ آج لوگ دیدار کے وہ معنی نہیں سمجھتے جو ہماری داستانوں کا اٹا



ہے۔ بچوں کو لفظ دیدار کے معنی سمجھاتے ہوئے مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا تھا کہ میں کسی اور ہی مخلوق سے مخاطب ہوں۔ پتہ نہیں یہ سفر کب ختم ہوگا.....

آخر کار ناظم شب نے اپنا پردہ اٹھا لیا تھا۔ شہر اور اس کے نواح میں دھند کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا دوست سے ملنے سے پہلے بستی کا ایک چکر لگا لوں۔ ہو سکتا ہے اتفاقاً تیسری گلی میں کامنی کا دیدار ہو اور ہیولی ہم زاد کی مردنی جی اٹھے۔ موسم کہرنے کس بے دردی سے میرے ذہن کے نہاں خانوں سے اسے نوح پھینکا ہے۔ اور ایک بے نام غنودگی میرا مقدر تھی۔ کامنی پتہ نہیں پوجا کی بٹی میں کون سے پھول لیے نظر آئے گی۔

بس اسٹینڈ پر اترا تو بے اختیار ماں کا خیال آیا۔ کلفت شب اس سفر کا حاصل ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا مسافت چند ہی لمحے رہ گئی ہے۔ گیارہ گلی۔ سحر نے ابھی شہر کی زندگی کو ابھی ساکت ہی رکھا تھا۔ البتہ مندر کی سمت گھنٹیوں اور باجوں اور نعروں کی آوازیں لگاتار آرہی تھیں۔ میں نے تیز تیز قدم اٹھائے۔ آٹو اسٹینڈ پر مجھے کامنی کے پتا کا تصور آیا۔ مین روڈ سے ملحق بائیں جانب کی گلی چند قدم رہ گئی تھی۔ اب شور کی آوازیں اور بھی بلند ہو گئی تھیں۔ جیسے ہی اندر گلی میں داخل ہوا میں نے دیکھا لوگوں کا اثر دھام مندر کی جانب رواں ہے۔ کچھ لوگ ایک پالکی کو اپنے کاندھوں پر لیے مندر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں تیز تیز آگے بڑھتا گیا۔ پالکی پر سوار سادھوی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ساکت سا ہو گیا۔ کامنی اپنی آنکھیں بند کیے، پتہ نہیں کن گیانوں میں گم تھی۔ میں نے سامنے گیارہ گلی پر نظریں دوڑائیں۔ مگر وہاں کیا تھا۔ وقف بستی کی جگہ کنکر ریٹ سے بھرا میدان کوئی گلی نہ تھی۔ کوئی مکان نہ تھا۔ کوئی مکین نہیں۔ کوئی کلغی نہ تھی، طویل قامت مور پر واز کر چکا تھا۔ ●●

## وارث علوی

اردو ادب میں جب جدید افسانے کی آواز بلند ہوئی اس وقت لکھنے والوں میں جوئے اور جدید افسانہ نگار آئے ان میں اکرام باگ کا نام، بہت نمایاں تھا۔ شب خون میں مسلسل چھپتے رہے ایک خاص قسم کا پراسرار افسانہ ان کے قلم سے سامنے آیا۔ پڑھ کر حیرانی بھی ہوتی، اس کی کوئی معنویت قاری کے ذہن پر آشکار نہیں ہو پاتی، لیکن اکرام باگ اسلوب، واقعہ نگاری اور وہ عناصر جو افسانے کو دلچسپ بناتے ہیں اس میں بھر پور انداز سے ملتے تھے۔ میرا خیال ہے اکرام باگ کی زیر نظر کتاب قارئین کو ایک انوکھے تھیر کے جذبے سے سرفراز کرے گی اور ایسے افسانوں پر جتنا تھکاؤں کو لکھنا چاہیے وہ نہیں لکھا گیا تو اب کتاب ہاتھ پر ہوگی تو امید ہے اردو کی افسانوی تنقید اکرام باگ کی قدر شناسی کی مخلصانہ کوشش کرے گی۔

اکتوبر ۲۰۱۳

# ANDOKHITA

SHORT STORIES : IKRAM BAAG

